

رحمہ اللہ فیما سبہ ۱۱۵۴



فیما سبہ
۱۱۵۴

تصانیف نیازپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انہوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غریب زبانوں میں منتقل کیے گئے۔

قیمت دو روپیہ (نکار)
علاوہ محصول

جہانستان

ادیب نگار کے مقالات ادبی کا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے شائع کیے گئے ہیں۔ زبان قدرت بیان عالی تخیل و پاکیزگی خیال کے جہیز شایگانہ کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ مجرہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (لکھنؤ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

ادیب نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہو سکے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلین کے لحاظ سے فن انشائیہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پیچھے معلوم ہوتے ہیں موصویر حضرت نیاز ۲ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (نکار)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تحسین اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشائیہ سحر خیز کے درجہ تک پہنچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (لکھنؤ)
علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوں شاعر کا شکار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر سید نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب کلام، اس کی رجحانیں آپ کو کسی اندازہ نگار کے لئے ضرورت باقی نہیں رہتا۔ قیمت دو روپیہ (نکار) علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری شاعر کا شکار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا سلیقہ ذکر موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندی شعرا کے کلام کا انتخاب معجمہ کے درجہ سہ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہ ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول

”نگار“ چٹوری سلسلہ

۱۔ ”دراپہ السحاب کہت“ یہ ڈاکٹر انشا پیش کو آسودہ کرنے کا پہلا قدم ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو آٹھ سارہ (مشہور ایکٹس) کو لکھے تھے اور جو دنیا کے ادب و انشا میں روائے ہیں طرز انشاء و قدرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اس کا اندازہ ایلان قطار کو لکھنے میں (۳) ”دراپہ السحاب کہت“ (۴) آزاد خیالی شعری کے قلم سے مسئلہ خلافت و امارت لاکھ قدیم و لائیکل بھی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و تجویز بعض ایسی باتوں کے لکھنے کا امکان جو جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پہلا مقالہ ہے جس کا عنوان یہ ہے: مسئلہ خلافت کے مبادی و مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فرد و جزئیات وغیرہ۔ صفحہ ۱۴۱۔ قیمت ۱۰ روپیہ علاوہ محصول

”فخر کار وال“ کا حقہ عدم گنجائش کے باعث اس جینے کے پرچے میں شائع نہیں ہو سکا

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ ہر چھ مہینے کی صورت میں ۱۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (حصہ ششماہی تین روپیہ) (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) رسالہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۴)	فہرست مضامین جولائی ۱۹۲۸ء	شمار (۱)
----------	---------------------------	----------

۲	ملاحظات	
۹	مسئلہ خلافت و امامت	ذاکر حسین
۲۳	کتوبات نیاز	
۲۸	سیاسیات یورپ	
۳۵	راہب (ڈرامہ)	افضل
۴۸	ریاستوں کی آزادی وفاق کے نقطہ نظر سے	
۵۵	ابوالکمال امجد امیٹھوی	
۵۹	باب الاستفسار	
۶۲	مطبوعات موصولہ	
۶۵	منظومات	اعجاز (اکبر آبادی) - فضل الدین اثر - مرست گلین - شہاب (اسراوی) - مرزا جعفر علیخان اثر
۱۸۶	اسلامی بہتد	

اسلامی بہتد (تباہ کن و فتنہ انگیز) جو قطعاً نازل نہیں پیدا کرنا شیخ خورشید علی پروفیسر فیض آباد لکھنؤ کے پوتے لکھنؤ

نگار

اڈیسٹرہ۔ نیاز فچپوری

جلد ۳۴	جولائی ۳۸ء	شمارہ ۱
--------	------------	---------

ملاحظات

لکھنؤ اور شیعہ سنی نزاع

دنیا میں اختلاف ہمیشہ رہا ہے اور رہیگا اور غالباً یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ نوع انسانی کی ترقی بہت کچھ اسی "اختلاف" کی ممنون کرم ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی اختلاف نے ملک کے ملک ویران کر دیے اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اختلاف وہی ایک مگر نتیجے دو ہیں: اس کے سمجھنے کے لئے ذہن انسانی کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ اختلاف دو قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک ذہنی اور دوسرا اعتقادی۔ ذہنی اختلاف سے میری مراد ان دو آزاد ذہنوں کا اختلاف ہے جن میں سے ہر ایک حق و حقیقت کی جستجو چاہتا ہے اور اعتقادی اختلاف سے مراد ان دو مذہبی جماعتوں کا اختلاف ہے جن میں سے ہر ایک ذہنی غلامی میں مبتلا ہے اور دوسرے سے محض اپنی روایات کو تسلیم کرنا چاہتا ہے۔

دہی قسم اول کا اختلاف ہے جس نے حکماء و فیلسوف، مخترع و موجد دنیا میں پیدا کئے اور یہی دوسری قسم کا اختلاف ہے جس نے انسانیت کو شل کر کے رکھ دیا۔ سنی شیعہ اختلاف بھی یہی روایتی اختلاف ہے، جس کا تعلق ذہن کی آزادی سے بالکل نہیں ہے بلکہ صرف ان معتقدات سے ہے جن کو ہم نے بغیر ذاتی فکر و تدبیر کے صحیح یاد کر لیا ہے اور جن کے خلاف سننے کی تاب ہماری نگ نظر ہی نہیں لاسکتی، بہر حال یہ تو اصولی گفتگو ہے جس کا یہ محل نہیں اس وقت و کیفیت صرف یہ ہے

کہ لکھنؤ میں جو یہ نزاع پیدا ہوئی ہے اس میں واقعی غلطی کس کی ہے اور فساد کا اصل ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا
سستی کہتے ہیں کہ ہم خلفاء کو اچھا سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں علی الاعلان اس کے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے شیعہ
کہتے ہیں کہ ہم اُن کو بُرا سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں بھی اُن کو بُرا کہنے پھرنے کا حق پہنچتا ہے۔ اس مسئلہ کو آپ اگر کسی منصف حاکم
کے سامنے پیش کریں گے تو وہ یقیناً یہی فیصلہ صادر کرے گا کہ علی الاعلان ہم خلفاء کو بُرا کہہ نہ وہ اچھا کہیں اور یہی اصل روح
ہے اس فیصلہ کی جو یو۔ پی کی حکومت نے کیا ہے، لیکن شیعہ اس پر مطمئن ہیں اور سستی نہیں ہیں۔ عام طور پر اس بحث کے
سلسلہ میں سینوں کی طرف سے عقلی یا اخلاقی استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی کی تعریف کرنا اتنا بُرا نہیں ہو سکتا جتنا اُن کو
گالیاں دینا، لیکن اس قسم کی جھڑپوں سے سستی اس وقت کام لے سکتے جب خود اُن کے تمام عقاید عقل پر قائم ہوتے، معادلہ
مذہب کا ہے جس میں عقل کو دخل نہیں اس لئے کسی عقلی حجت سے کام لینے کا حق نہ سینوں کو حاصل ہے نہ شیعوں کو نہ دونوں
جیسے ہیں، ویسا ہی ان کو سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا

حکومت یقیناً مذہبی آزادی کی طرفدار ہے، لیکن اگر یہ آزادی فتنہ و فساد کی باعث ہو، تو بیشک اس آزادی کو چھین
جانا چاہئے اور اس بنا پر اگر ”درج صحابہ“ کے لئے یہ پابندی عاید کی گئی ہے کہ پہلے اس کی اجازت حاصل کر لینا ضروری ہے
تو میں اس کو انتہائی نرم حکم سے تعبیر کروں گا، ورنہ فیصلہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ درج صحابہ قطعاً ممنوع ہے۔ اس مسئلہ میں یہ
بحث اٹھانا کہ عقاید کے لحاظ سے شیعہ قابلِ استحسان ہیں یا سستی، بالکل بے محل ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان میں کون اپنے
مسلمات مذہب سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے، خواہ وہ کہتے ہی نفوذ مہل کیوں نہ ہوں

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ شیعہ کا خلفاء کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا، نہایت رکیک حرکت ہے، لیکن اس کا افکار سستی بھی
نہیں کر سکتے کہ ان کے مسلک و مذہب کی بنیاد ہے اور آج سے نہیں بلکہ اسی وقت سے جب واقعہ کو بلا پیش آیا، لیکن کیا
کوئی سستی کہہ سکتا ہے کہ خلفاء یا صحابہ کی مدح و ثنائیں جلوں نکالتے پھرنایا کوئی مخصوص بزم قائم کر کے اس کا اعلان کرنا اس کے
مذہب میں داخل ہے۔ یہ تو خیر صحابہ کا معاملہ ہے، میں کہتا ہوں کہ خود رسول اللہ کی شان میں بھی اس انداز سے قصائد پڑھیں
پڑھنا یا ذکر میلاد کی صحبتیں برپا کرنا سینوں کے ایمان و مذہب میں داخل نہیں

اب رہا سینوں کا یہ استدلال کہ آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے ان کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ جن کو وہ اچھا کہتے ہیں ان کو
اچھا نہ کہیں، سو اس میں شک نہیں کہ ان کی یہ دلیل خاصہ وزن رکھتی ہے، لیکن اگر اسی کے مقابلہ میں شیعہ یہ کہیں (اور
ان کا کہنا بالکل حق ہے) کہ وہ صحابہ کو بُرا کہنے کا حق مذہب کے لحاظ سے بھی رکھتے ہیں اور آزاد شہری ہونے کے لحاظ
سے بھی، تو کسی کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ ہر چیز بظاہر یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ”اچھا کہنے اور بُرا کہنے“ کو

لے مکمل ہے شیعہ حضرات اپنے مذہب کی ابتداءات رسول کے بعد جاسے قرار دیتے، لیکن میرے نزدیک شیعوں کی اجتماعیت نے مذہب کی حیثیت و افادہ
کو بلا کے بعد اختیار کیا ہے۔

ایک ہی درجہ کی چیز قرار دی جائے، لیکن جب سوال دلائل زاری کا آجائے گا تو ہمیں اس بارے میں شک و شبہ کے قانون کے لئے صریح صحابہ
ہی حکم رکھتی ہے جو شیعوں کے لئے تبراً

دنیا کا کوئی فیصلہ ہو، نفسیاتی حقیقت کو اس سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا پھر کون ہے جو دشمن کی تعریف شکرنا خوش
نہ ہوگا اور اس کی دلائل زاری نہ ہوگی۔ شیعوں کو نفس درج صحابہ سے کوئی عقائد نہیں ہے بلکہ اس اسیرٹ یا روح سے ہے جو
اس کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ شیعوں کا موجودہ اصرار ضد اور ہٹ کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ یہ انہیں
خود بھی معلوم ہے کہ مذہب کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور لکھنؤ میں ۱۹۰۹ء سے قبل کبھی یہ بدعت نہیں دیکھی گئی
میں نے خود یہ جلوس دیکھے ہیں اور ان دالیلوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے آپ کو گزار کر ادینے کے لئے باہر نکلتے ہیں، اسی
کے ساتھ میں نے وہ الفاظ بھی سنے ہیں جن کے ذریعہ سے ”مذہب صحابہ“ کا فرض انجام دیا جاتا ہے، سچ عرض کرتا ہوں کہ جب
یہ منظر میرے سامنے آیا ہمیشہ ”تم ردناہ افضل سافلین“ کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی

شیعہ سنی کا مذہبی اختلاف تو خیر قیامت تک دور نہیں ہو سکتا، لیکن مذہب کی بنیاد پر تمدنی و معاشرتی تعلقات کو خراب
کر لینا اتنی بڑی حماقت ہے کہ شاید مذہب بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ عقل کا حامی وہ بھی نہیں ہے
ہر چند حکومت فتنہ و فساد کو روک سکتی ہے، وہ ایسے قانون وضع کر سکتی ہے جو دلوں کے والوں کو ایک دوسرے سے
دور رکھ سکے، لیکن یہ جو کچھ ہوگا عارضی ہوگا، ناقابل اطمینان ہوگا۔ حقیقی امن و سکون اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب
خود جماعت کے اندر اس کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ بغیر رواداری کے ممکن نہیں
اپنے جذبات کے مقابلہ میں دوسروں کے جذبات کی رعایت آسان نہیں، لیکن انسانیت کا اقتضاء یہ حال یہی ہے
اور جب تک ہم اس پر کاربند نہ ہوں صرف ”حیوان ناطق“ ہیں، انسان نہیں ہیں

اب رواداری کے باب میں یہ کہنا کہ فلاں جماعت تو اس سے کام لے اور فلاں نہیں، ذرا غلط اصول ہے، رواداری
کے معنی ہی ہیں دونوں فریق کا ایک دوسرے کی طرف جھکنا، اس لئے صحیح معنی میں رواداری کی شان اس وقت پیدا ہو سکتی
ہے جب دونوں اپنی اپنی جگہ اشارے کام لیں، لیکن اگر کوئی ایک فریق اس کے لئے طیار نہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ
دوسرا بھی طیار نہ ہو۔ اگر شیعہ (باوجود اس کے کہ خود حضرت علی کی زندگی بیکسر مسالمت اور رواداری کی زندگی تھی) اسپر
آکادہ نہیں تو نہ ہوں۔ شیعوں کو وسعت نظر سے کام لیکر اشارہ دکھانا چاہئے اور انہیں اعلان کر دینا چاہئے کہ جو کہ شیعوں
کے لئے مذہب صحابہ باعث دلائل زاری ہے اس لئے ہم اس کو ترک کئے دیتے ہیں

یہ شیعوں کی اتنی بڑی اخلاقی فتح ہوگی کہ شیعہ حضرات خود اپنی مغلوبیت کو چند دن میں محسوس کرنے لگیں گے اور
ہو سکتا ہے کہ اس کا رد عمل یہ ہو کہ وہ بھی مذہب صحابہ کو گوارا کر لینے کا اعلان اپنی طرف سے کر دیں
شیعہ سنی، بہر نوع ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں، ایک ہی قوم کے افراد ہیں، ایک ہی خدا و رسول کے ماننے والے ہیں

ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لکھ رہا ہے گا اگر وہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں، ان کو یہ مذہبی تعصبات ترک کرنا ہوں گے، اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں، ورنہ قانون قدرت، جس کی زد سے کوئی رسول بچا ہے نہ آل رسول، نہ خلفاء اس کا مقابلہ کر سکے ہیں نہ صحابہ اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا اور اسے کبھی اس کشتی کو ساحل تک نہیں پہنچایا جس کے بیٹھنے والوں نے خود ساحل تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔

کانگریس سے ہم کیا چاہتے ہیں

پچھلے چھ گیارہ سالوں میں، مختصر میں نے کانگریسی حکومتوں کی اس ذہنیت کا ذکر کیا تھا جو ہندو مسلم کشیدگی میں اضافہ کا باعث ہو رہی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ کانگریس نے اپنا نصب العین چاہے ”پورا سواراج“ مقرر کیا ہو یا ”راج“ لیکن جن مانتوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہے وہ ہندوستان کے ”مستعمراتی آزادی سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ اس میں شک نہیں کہ مستعمراتی آزادی ایک نوع کی آزادی ضرور ہے، لیکن بے بہر حال وہ غلامی ہی کی ایک قسم جس میں ہمیشہ اکثریت کو قایدہ اور اقلیت کو نقصان پہنچتا ہے تاکہ یا تو اقلیت اکثریت کے ساتھ شامل ہو جائے یا اس کے لئے مخصوص تحفظات قائم کر دئے جائیں

میں نے یہ تحفظات کی پالیسی کو بھی مفید سمجھا اور نہ جداگانہ انتخاب کو، کیونکہ ان کی بنیاد بے اعتدالی ہے اور وہ قوموں کے تعلقات جب تک اعتماد پر قائم نہ ہوں، آپس کا اختلاف کبھی مرٹ نہیں سکتا۔ اسی لئے میں نے نہ کبھی ”مسلم لیگ“ کی طرف اشارہ کیا اور نہ مسٹر جینا کے مطالبات کی، کیونکہ اس قسم کا سودا بیچنے کے لحاظ سے ہمیشہ نقصان رسا ثابت ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے اخلاق اور اپنی قوت پر بھروسہ کر کے شریک ہوتے اور متفقہ عزم کے ساتھ ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، یہاں تک کہ آج کانگریس کا مفہوم ہی ”ہندو جماعت“ ہو کر رہ گیا ہے

ایسا کیوں ہوا اور اس غلطی کا ذمہ دار کون ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی جستجو میں ارباب کانگریس کی ذہنیت کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ اس باب میں اگر مسلمانوں سے غلطی ہوئی تو ہندوؤں سے بھی ہوئی اور سچ پوچھئے تو ان سے زیادہ ہوئی

مسلمانوں کی غلطی تو یہ تھی کہ انہوں نے خود اپنے اوپر اعتماد نہ کیا اور ہندوؤں کی یہ کہ وہ اپنے آپ کو قابل اعتماد نہ بناسکے۔ انہوں نے زبان سے تو ہمیشہ یہی کہا کہ وہ مسلمانوں کے تمام مطالبات ماننے کے لئے طیار ہیں، ان کے قومی و مذہبی جذبات کی رواداری ان کا فرض ہے، لیکن علاوہ اس کو صحیح نہ ثابت کر سکے

وزارتیں قبول کرنے سے قبل جو حالت کارکنان کانگریس کی تھی وہ یقیناً مختلف تھی اور اسی کو سامنے رکھ کر بعض مسلمانوں کو اس میں شرکت کی ہمت ہوئی تھی، لیکن جب قیام حکومت کے بعد سے ہندوؤں کی یہ نیازیں مسلمانوں کی طرف سے بہت

نایاں ہو گئیں تو مسلمان سخت مایوس ہو گئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ جو کانگریس حکومتوں کے قیام سے قبل مردہ ہو چکی تھی
 بعد کو بھراس میں آثار نبات نظر آنے لگے اور فرقہ وارانہ لڑائیاں بھی بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہوئیں
 کانگریس حکومتوں میں ہندو پیپاک کا یہ خیال کہ اب حکومت ہندوؤں کی ہے، نہایت خطرناک بات ہے اور اس خیال کے
 تحت جو زیادتیاں ہندوؤں کی طرف سے ہو رہی ہیں اس کے ذمہ دار یقیناً اور باب کانگریس ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کانگریس
 کا نصب العین یہاں ہندو راج قائم کرنا ہے، لیکن اس وقت جن باتوں میں کانگریس کا نظام ہے ان کا طرز عمل بہت مشکوک
 ہے۔ مثلاً آپ زبان ہی کے مسئلہ کو لیجئے کہ کانگریس کا فیصلہ تو یہ ہے کہ ایک عام سہل زبان اختیار کی جائے جو ہندو مسلمانوں
 کے درمیان تبادلہ خیالات کا مشترک ذریعہ قرار پائے، لیکن کانگریسی وزراء کا یہ حال ہے کہ وہ قصداً اس میں سنسکرت کے مشکل
 الفاظ لانے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر جو زبان وہ ہر وقت اپنے گھروں میں بولتے ہیں اسے اپنی پیپاک تقریروں
 اور تحریروں میں استعمال نہیں کرتے۔ پھر کیا پنڈت جو اس ہندو کو اس کا علم نہیں ہے۔ کیا گاندھی جی اس سے
 ناواقف ہیں، کیا کانگریس کی آل انڈیا اور کنگ کیٹیجی کے کانوں تک یہ شکایتیں اس وقت تک نہیں پہنچیں۔ یقیناً سب اس حقیقت
 سے آگاہ ہیں، لیکن وہ اس طرز عمل پر کتہ چینی نہیں کرتے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کی طرف سے بدظنی کا موقع ملتا ہے۔
 اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات میں کانگریسی وزراء کی طرف سے جو طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی غیر جانبدارانہ
 نہیں ہوتا اور حقیقت کو چھپانے میں انھیں ترکیبوں سے لبا جاتا ہے جو اس سے قبل کی حکومت اختیار کیا کرتی تھی۔
 بالآخر شہ جی وقت انتخابات کے مسائل سامنے آئے، کانگریس نے ایک تحریک (Muslim Mass
 Contact) کے نام سے شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس براہ راست عام مسلمانوں
 سے تبادلہ خیال کر کے ہندو مسلم کشیدگی کو دور کرے اور کانگریس کے اغراض و مقاصد ان کو سمجھائے۔ اس میں شک
 نہیں کہ تحریک نہایت مفید تھی لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اگر کانگریس واقعی پورے عزم کے ساتھ وسیع پیمانہ پر اس
 تحریک کو شروع کر دیتی تو نہ مسلم لیگ کو ابھرنے کا موقع ملتا، اور نہ انتخابات میں کانگریس کو ناکامی ہوتی
 میں یہ جانتا ہوں کہ ہندو نہ جانتے ہوئے بھی مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے پر ایک حد تک مجبور ہیں اور اس کا سبب
 صرف یہ ہے کہ اگر ہندو مسلم کشیدگی نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی تو بھران کا مستعمراتی آزادی والا خواب بھی خواب
 پریشاں ثابت ہوگا، لیکن اس مصلحت کے اقتضا کے لحاظ سے جو طریق کار وہ اختیار کر رہے ہیں، صحیح نہیں ہے
 پنڈت جو اس ہندو نے سب سے پہلے خط لکھا تو اس وقت لکھا جب انتخابات میں کانگریس کو مسلم لیگ کے
 خلاف ناکامی ہوئی تھی اور غالباً اس خیال سے لکھا تھا کہ اگر مسٹر جینا مصالحت کے لئے راضی ہو گئے تو گویا یہ رضامندی
 صرف مسلم لیگ بلکہ تمام مسلمانان ہند کی ہوگی، لیکن یہ خیال پنڈت جی کا صحیح نہ تھا جس کا ثبوت اب خود مسٹر جینا کے جدید شرائط
 سے جن کے خلاف خود مسلمانوں کی بعض جماعتوں کی طرف سے احتجاج کیا جا رہا ہے، پنڈت جی کو مل گیا ہوگا

ہم جانتے ہیں کہ اگر دین کی ملاقات کے بعد ہی گاندھی جی کا سر جینا کو گفتگو سے مصالحت کا پیغام دینا کی بجائے رکھنا ہے اور ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی کی طرح مسٹر جینا کے دل میں بھی یہی ہو کہ وہ فاق کو قبول کر لیا چاہتے ہیں، لیکن مسٹر جینا یقیناً مسلمانان ہند کے صحیح نمائندے نہیں ہیں اور ان کا کوئی قول مسلمانوں کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا

مسٹر جینا کا اس شرط پر زور دینا کہ انھیں کو تمام مسلمانوں کا واحد نمائندہ سمجھا جائے، ممکن ہے اس میں ان کا جذبہ تفوق و حکمرانی بھی شامل ہو اور ہو سکتا ہے کہ درپردہ "وفاق" کی راہ کو آسان بنا دینا بھی ان کے پیش نظر ہو۔ بہر حال اس تمام گفتگو سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کانگریس واقعی مسلمانوں کو شریک کار بنانا چاہتی ہے اور ملک میں امن و سکون پیدا کرنا اس کا مقصود ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ وہ مسٹر جینا یا کسی اور ایسے ہی مدعی سیاست سے گفتگو کر کے مطمئن ہو جائے، بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے جذبات کو پہچانے اور سچے دل سے رواداری پر آمادہ ہو جائے اس کے جواب میں ارباب کانگریس کہیں گے کہ وہ بار بار اس کا اعلان کر چکے ہیں اور وہ ہر ایشیائے طیار میں، لیکن انکا یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عمل سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ارباب کانگریس لاکھ زبان سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہی ایک جزو سمجھتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں وہ ہم سے بالکل جدا ہیں اور ان کی ہر ہر بات سے جذبہ نفرت ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو دفاتر میں ملازم ہیں یا جن کو عمال حکومت سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ان سے پوچھئے کہ اس وقت مسلمان ہونا کتنا براہم ہے اور اس جرم کی کتنی سخت سزا اسے برداشت کرنا پڑتی ہے۔ پھر اگر ارباب کانگریس واقعی مسلمانوں سے اتحاد کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی تنہا تدبیر یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی جماعت کی اس ذہنیت کو دور کریں جو مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ اعتماد کوئی مادی چیز نہیں ہے جو ہم کسی سے لے سکیں یا کسی کو دے سکیں، اس کا تعلق دماغی کیفیت اور قلبی احساس سے ہے اور قلب و دماغ کا اطمینان صرف خلوص و صداقت سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ تو ہوا ہمارا وہ مطالبہ جو ہم کانگریس سے کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں مسلمانوں سے بھی کچھ کہنا ہے اور وہ یہ کہ کانگریس سے علیحدہ رہ کر وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کو اس کا یقین ہو تا کہ وہ اپنی جماعتی تنظیم کبھی کر سکتے ہیں یا یہ کہ ان میں واقعی کسی دلسوز اور مخلص رہنما کا وجود پایا جاسکتا ہے، تو ہم اس کا انتظار کر سکتے تھے کہ وہ پہلے آپ کو سنبھال لیں اور پھر کانگریس میں شریک ہوں، لیکن ان کا باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دور نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے دور کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارہ میں شریک ہو جائیں جو مذہبیات سے بالکل علیحدہ صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے اور ایسا ادارہ صرف کانگریس ہے۔ کانگریس میں شریک ہونے کے بعد تو مسلمان بیشک کسی ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے علیحدہ رہنے کی حالت میں ان کے مذہبی اختلافات انکی سیاسی تحریکوں کو بھی کامیاب نہ ہونے دیں گے

اس وقت مسلمانوں کی امیدیں سب سے زیادہ مسلم لیگ سے وابستہ ہیں لیکن بد قسمتی سے اس کشتی کا ناخدا ایسا

بر خود غلط اور ضدی واقع ہوا ہے کہ ساحل تک پہنچنے کی کوئی توقع نہیں۔ مسٹر جینا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کانگریس میں اس کے شریک نہیں ہوتے کہ وہاں ان کا شمار دوسرے درجہ کے لیڈروں میں بھی نہیں ہو سکتا اور مسلم لیگ کو اس کے کامیاب نہیں بنا سکتے کہ ان میں ایشیاء و قربانی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔ ان کو شرکت کانگریس کی دعوت دجاتی ہے تو وہ ایسی شرائط پیش کرتے ہیں کہ ہندو تو ہندو خود مسلمانوں کے لئے بھی قابل قبول نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اعتمادی کی کیفیت ان سے بالکل مفقود ہو گئی ہے

حال ہی میں مسلمانوں کا جو جلسہ عام ہوا تھا اور جس میں کانگریس سے مصالحت کا مسئلہ درپیش تھا، اس کی کارروائی دیکھنے سے ہماری مایوسیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ مسٹر جینا نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمان کمزور ہیں اور ہندو قوی اس لئے دونوں میں مصالحت ممکن نہیں۔ سر سکندر حیات خاں، شرکت کانگریس کو ہندوؤں کی غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو بدستور انگریزوں کا دست نگر رہنا چاہئے اور قومی اسپرٹ کو خیر باد کہہ دینا چاہئے۔ ان کے اندر ایسا خوف سا گیا ہے کہ بظاہر اس کے دور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اب چارہ کار سوائے اس کے کوئی نہیں کہ یا تو مسلمان کوئی اور لیڈر منتخب کریں اور اگر اس میں ناکامی ہو (جو یقینی ہے) تو پھر اپنی قوت اور خدایہ پیکر سے کر کے کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ اگر غلامی مسلمانوں کے لئے واقعی مقسوم ہو چکی ہے اور کانگریس میں شریک ہونا ہندوؤں کا غلام بننا ہے تو میں کہوں گا کہ یہ غلامی اس غلامی سے بہتر ہے جو وہ اختیار کرنا چاہتے ہیں

آئندہ جنوری ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذہ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں نہ کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کلام پیش کیا ان کو چھوٹے کی ہمت میر کو بھی نہیں ہوتی تمام اردو شعرا میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا بنالیا خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو انوس بنا دینا کہ اس باب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہو گا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے:- (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات۔ (۲) مصحفی تذکرہ نگاری حیثیت سے۔ (۳) مصحفی اور اس کے عصر اساتذہ۔ (۴) مصحفی اور اس کے تلامذہ۔ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر۔ (۶) مصحفی بحیثیت ایک انسان کے۔ (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے۔ (۸) مصحفی اور مختلف اصناف سخن وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ مضمون موصوفیہ زیادہ سے زیادہ اکتوبر ۳۹ء کے آخر تک پہنچ جانا چاہئے۔

منیر نگار

مسئلہ خلافت و امامت

(انسانیت اور اسلام کے نقطہ نظر سے)

جولائی ۱۹۳۷ء کے نگار میں بہ عنوان مندرجہ صدر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ گویا خلافت و امامت کے مسئلہ پر ایک غمگین بحث کی دعوت عام ہے اور نگار کے اڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اصل موضوع پر دونوں فرقوں کی جانب سے ایسے دلائل پیش کئے جائیں کہ دنیا کسی حد تک اس قدیم اور دشوار تر گفتنی کو سمجھانے کے قابل ہو سکے۔ اہل فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں پہلے انسانیت اور پھر اسلام کے نقطہ نظر سے گفتگو کرنے کا دعویٰ کیا ہے اس لئے آئیے دیکھیں کہ انسانیت و اسلام کے جو اصول انھوں نے مقرر کئے ہیں وہ کس حد تک لائق تسلیم ہیں اور انسانیت انھیں گوارا بھی کرتی ہے یا نہیں وہ انسانیت کا مدار عقل عمومی پر رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:-

”عقل عمومی سے میری مراد وہ معمولی فہم و فراست ہے کہ جسے روزمرہ کے کاروبار میں ہم کام میں لاتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم بہت سی بتائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومییت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کا اعتقاد انہیں بلا سمجھ بوجھ کراختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً سچ بولنا اچھا ہے۔ یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اس طرح ”انسان کا قتل کرنا“ وحشیانہ فعل ہے یا ”جھوٹ بولنا“ بری بات ہے۔ اس نوع کے تمام اصول و کلیات ایسے ہیں کہ جنہیں ہماری عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے“

افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی اس تشریح سے بھی ابہام رفع نہیں ہوتا کیونکہ اس سلسلہ میں اس امر کی تشخیص کہ فلاں بات سچ ہے اور فلاں جھوٹ کس کے ذمہ قرار پائے گی۔ یہ ایک الجھن ہے۔ اب میں ایک اور نگاہ سے اس قول کو جانچتا ہوں۔ اس بحث میں عقل عمومی کو حجت قرار دیا گیا ہے یعنی عقل عمومی جس شے کا انکار کرے وہ رد کر دینے کے قابل ہے اور جس شے کو قبول کرے وہ قابلِ اغذ ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح اناجیائے اور عوام کا اقرار یا انکار حجت ہو جائے تو کوئی اصل اپنے مقام پر ثابت نہیں رہتی۔ یہی عقل عوام تھی جو ایک زمانے میں

شہنشاہیت حلقہ کے سلسلے میں، ہونے والی تھی اور اب یہی عقل جمعی ہے جس کے لئے بقول آن کریم اشراکیت جائز نظر
نہی ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ عوام ہر زمانہ میں کالانعام ہوا کرتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ عوام ہمیشہ ایک مخصوص جماعت کے ہاتھ
میں ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے عوام کا رجحان کبھی سند کے قابل نہیں ہو سکتا اور صاحب نظر عوام کی قبولیت یا عدم قبولیت کو
کیسی اہمیت نہیں دیتے بلکہ نفس مسئلہ پر نظر رکھتے ہیں۔

میرے قول بالا کی دلیل خود اس مضمون میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ”کسی مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہئے
کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا حق غصب نہ ہوتا ہو“۔ یہ جز اول ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ ”الوہی امامت سے
انسانی جماعت کا حق غصب ہوتا ہے“۔ یہ جز ثانی ہے ان دونوں کو ملائے سے جو نتیجہ نکلے گا وہ سامنے ہے۔ بالکل ممکن ہے
کہ عقل جمعی ہمزبان ہو جائے لیکن یہ ہمزبانی صاحب فکر کو مسخر نہ کر سکے گی۔ وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس قضیہ کے اجزائو قائم کئے
گئے ہیں وہ کہاں تک صحت رکھتے ہیں۔ اب میں ان مطالب کی طرف بڑھتا ہوں جو اس تحریر کی روح ہیں۔
”رسول اکرم نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں اور یہ مسئلہ شاہان خود مختار کی طرح
سلسلہ نسل قائم رہے۔“

(۲) حضرت علی کی ”الوہی امامت“ کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو بیضوع
جائی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم وہ نہیں ہے جو الوہی امامت کی تصدیق کرتا ہو۔
یہ دعوے ہیں اور اس دعوے کو بنیائے کے لئے کچھ تحقیقات قائم کرتے ہوئے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ الوہی امامت کا مطلب یہ ہے کہ
”خداوند کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریم کے بعد ان کے داماد حضرت علی خلیفہ ہوں اور ان کے بعد یہ منصب جلیل
ان کی اولاد میں سے کسی کو عطا کر دیا جائے اور اس طرح یہ سلسلہ تاقیامت جاری ہے۔“
اس نتیجہ پر زور دیتے ہوئے کچھ اور بھی فرمایا گیا ہے جو قابل غور ہے، طوالت کے خیال سے اپنے ہی لفظوں میں ان کا خلاصہ
درج کئے دیتا ہوں:۔

- (۱) خلافت و امامت صرف علی کی نسل کے لئے مخصوص ہے
- (۲) ہر خلیفہ کی جگہ اس کا بیٹا ہی مستنشین ہوگا۔ نسل شاہان خود مختار
- (۳) تمام دنیا کے مسلمان حضرت علی کی داعی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں وہی اولوالا امر و آقا و مولا ہوں
اور ہر مسلمان ان کے سامنے تسلیم خم کرنے پر مجبور۔ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کتنے ہی متقی و متورع ہوں،
اس سے محروم رہتے ہیں
- (۴) بانی اسلام کی گویا خواہش تھی کہ ان کی نسل تاقیامت مسلمانوں پر حکومت کرے اور یہ حکومت

مطلق العنان ہو اس طرح خاندانہ علی کے لئے گویا نسلی امتیاز قائم ہو جاتا ہے اور آل علی کا ہر فرد گویا ان کے پیشوا ہے

یہ حق لیکر پیدا ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کے سامنے سرعقیدت جھکائیں۔

اور یہ وہ باتیں ہیں جنہیں عقل عمومی قبول نہیں کرتی۔

قبل ازیں کہ دعویٰ اور استدلال پر توجہ کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انصاف پسند حضرات اس پر بھی غور فرمائیں کہ آج ہم جس نسلی امتیاز سے متضرر ہیں، آج جو شہنشاہیت ہماری نظروں میں کشاکش ہے کیا عقل عمومی اس سے اسی طرح منفر اور بیزار رہی ہے اور کیا مستقیفہ بنی ساعدہ میں بمقابلہ انصار جو یہ استدلال پیش کیا گیا تھا کہ ”الائتہ من قریش“ کیا اس کے معنی اس کے سوا کچھ اور تھے۔ کیا اس استدلال سے نسلی امتیاز کی بونہیں آتی اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر عقل عمومی آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے پر کیوں پائل ہے اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جو صورت اسلامی حکومت کی پائی گئی کسی اور شہنشاہیت نہ تھی!

اب رہا نسلی امتیاز کیا میں سوال کہ ممکنات میں اور مختلف اقسام میں اور مختلف ذرائع میں اس امتیاز کا احساس ہوتا ہے یا نہیں؟ اور آج بھی ہے یا نہیں؟ یہ عالمگیر احساس مجھے تو کبھی کم ہوتا نظر نہ آیا بلکہ یہی نوع انسان کی ایک عظیم جماعت ہمیشہ اس کی حمایت کرتی نظر آئی

یہ خیال کہ اسلام اس نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا کم از کم کلام مجید سے تو ثابت ہوتا نہیں بلکہ بروایات اس کے اس امتیاز کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحا و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین“

کیا اس سے آل ابراہیم اور آل عمران کا نسلی امتیاز ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے بھی تمیز تر سنئے:-

”ام یسجدون الناس علی ما آتاهم اللہ من فضله لقد آتیانا آل ابراہیم الکتاب والحکمة و آتیانا ہم

ملکا عظیمیا فمنہم من آمن بہ ومنہم من صد عنہ و کنتی بجهنم سعیرا“

دیکھو یہ لوگ ان لوگوں سے حسد رکھتے ہیں اس لئے کہ جو خدا نے اپنے فضل سے انہیں عطا کر دی۔ بے شک ہم نے آل ابراہیم کو کتاب بھی دیدی اور حکمت بھی اور انہیں ملک عظیم عطا کر دیا اب کوئی تو اس پر ایمان لاتا ہے اور کوئی نہ کرتا ہے اور جب ہم کے شعلے اس کے لئے بہت کافی ہیں)

آل ابراہیم پر بہکتوں کی بارش اور اس شد و مد سے کہ جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے لئے جہنم کے شعلے ہیں

کس امر پر وال ہے اور کیا یہ اس امر کا یقین ثبوت نہیں ہے کہ خود شیت الہی نوعی اور نسلی امتیاز کی حامی ہے

بالشک و شہ رسول اللہ کا مقصود جو اسلام لیکر دنیا کے سامنے آئے دنیا و عقبیٰ میں صرف سعادت بشری کا حصول تھا اور چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے دنیا آخرت کا مقدمہ ہے اور دین وحی الہی ہے اس لئے اس میں کسی انسانی

مصلحت انسانی کو دخل نہیں ہو سکتا اور اس کی تبلیغ میں ایک پیغمبر کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے لئے یا اپنی نسل کے واسطے یا اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر جائے اگرچہ دنیا یہ شبہ کرتی ہے اور بعض نے تو تمام جہاں اسکا اعلان بھی کر دیا ہے چنانچہ یہ زیادہ کہتا ہے :-

بیت ہاشم بالملک ولا
خبر جار ولا وحی منزل

ایک ہاشمی نے سلطنت کے لئے یہ کھیل کھیلایا حالانکہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی۔ - شیعہ حلقوں میں جس سلطنت اور جس حکومت کو آل نبی کا حق سمجھا جاتا ہے، وہ دنیاوی حکومت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی سعادت کبریٰ ہے جسکا راز آنحضرت کے سینے میں رکھا گیا اور جس کو پردے کا رولانا بھی آپ کے فرایض میں داخل تھا۔ مقصد الہی یہ تھا کہ اس قانون کے ماتحت حیات انسانی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ سعادت کا کوئی انفرادی و اجتماعی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کوئی قانون زیر عمل نہیں آ سکتا جب تک کہ حکومت کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو۔ چنانچہ حضرت پیغمبر اپنے وقت میں خود حاکم تھے لیکن یہ حکومت نہ شہنشاہیت تھی نہ اسے ”ڈکٹیٹر شپ“ سے تعلق تھا اور نہ ”جمہوریت“ کی ممنون احسان تھی بلکہ فی الحقیقت یہ حکومت، نبوت الہیہ کی ایک شاخ تھی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ نبوت کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ بارگاہ الہی کے احکام اس کی مخلوق تک پہنچادیں اور دوسرا یہ کہ ان کے اجر کا انتظام بھی فرمائیں۔ اس اعتبار سے جس طرح نبوت من جانب اللہ ہے اسی طرح یہ حکومت بھی ہے اور رسول اللہ کے بعد لامحالہ ہم کو اس کے لئے محل قابل کی تلاش کرنی پڑے گی یہاں علی و عمر کی بحث نہیں ہے۔ اگر علی محل قابل ہیں تو چشم مار و شن اور اگر عمر اس کی قابلیت رکھتے ہیں تو دل و شام گور اس کا ذریعہ و شناخت بھی صرف زبان وحی ہونا چاہئے جو عقل عمومی سے بہت زیادہ بلند ہے

جائیکہ سلطان خیمہ زد و غوغا نباشد عام را

ظاہر ہے کہ اس حکومت میں اکتساب کو دخل نہیں تھا بلکہ یہ عطیہ الہی تھی اور یہ جہاں بھی قائم رہا اس کی شان برقرار رہنی چاہئے۔ جہاں پائی جائے من اللہ پائی جانی چاہئے اور ”من اللہیت“ کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف رسول ہے۔ اب اسے حکومت الہیہ سمجھئے، خلافت الہیہ کہئے، امامت الہیہ فرمائیے جو کچھ چاہئے کہئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس چیز کو خود رسول بھی اپنے اختیار سے کسی کو عطا نہیں فرما سکتے تھے!

”ربک یخلق ما یشاء و ینحار ما کان لہم الخیرۃ“

یہ ہے وہ امامت الہیہ جو طبقہ شیعہ کا مطمح نظر ہے۔ اس امامت کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ عوام بھی اسکے ساتھ رہیں اور اس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے پروپیگنڈا کرے۔ اس قدر بیان سے غالباً امامت الہیہ کے متعلق شیعہ نظریہ واضح ہو گیا ہوگا

حضرات اہل سنت جن کو خلفاء کہتے ہیں ہم بھی انہیں خلفاء کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے اتفاق سے وہ خلیفہ بنے اور ہم بھی اسی کے قابل ہیں وہ کہتے ہیں اسچھ ہی لیکن یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی حکومت، حکومت الہیہ ہے کیونکہ اجماع و سوری خود اس کے منافی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ حضرات اہل سنت جن کو خود حاکم بنالیں اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اب اس کا سر قول، ہر فعل، ہر حرکت حکم خدا ہے اور یہیں سے سارا جملہ پیدا ہوتا ہے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم اس کو ضرور حاکم اسلامی سمجھیں گے۔ اس کی حکومت، حکومت اسلامی کہلائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے حکومت الہیہ بھی تسلیم کر لیا جائے

الغرض! شیعہ کے نزدیک خلفاء کی خلافت ایک دنیوی قسم کی حکومت تھی اور یہی سبب ہے کہ علی مرتضیٰ کو بھی اس خلافت کے لحاظ سے جو علی الظاہر انہیں اصول کے ماتحت انہیں ٹی کوئی خاص فضیلت حاصل نہیں ہوئی اور اس خلافت کے باعث عالم تشیع سے روشناس نہیں ہوئے۔ اگرچہ چند روزہ حکومت نہ ہوتی تو بھی علی بہر حال علی ہی رہتے فاضل مضمون نگار نے صفحہ ۶ پر جو تحقیقات قائم فرمائی ہیں اگرچہ وہ بہت کچھ بحث طلب بلکہ اصلاح طلب ہیں لیکن ان سے اور بعد کی تشریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک اولاد علی میں خلافت کا محصور ہونا دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہے۔ لیکن حق تلفی کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دو برابر کے حقداروں میں سے کسی ایک کا حق غصب کیا جائے یا کسی زیادہ مستحق شخص کے مقابلہ میں کم استحقاق رکھنے والے کو ترجیح دی جائے۔ لیکن چونکہ "امامت الہیہ" کا تعلق اکسابات دنیاوی سے نہیں ہے جن میں فرق و امتیاز کا پایا جانا ضروری ہے بلکہ محض مشاء خداوندی سے ہے اس لئے اگر اس کے صحیح مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ:-

”خداوند عالم نے کرچا ہے کہ رسول کریم کے بعد خلافت الہیہ علی ہی کے لئے ہے اور علی کے بعد اس کے گیارہ فرزندان کے لئے“

تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ ہاں یہ خیال دماغ سے نکل جانا چاہئے کہ یہ خطیہ ان لوگوں کو اولاد رسول ہونے کی حیثیت سے ملا ہے یا رسول یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہے، کیونکہ اگر اولاد رسول ہونے کی حیثیت مد نظر ہوتی تو خود علی کو یہ شے کیسے ملتی، اور اگر اولاد علی کا لحاظ کیا جائے تو علی مرتضیٰ کی اولاد دوسری بی بیوں سے بھی ہے یہ غصب وہاں کیوں دہونچا اور اگر بنو فاطمہ کا لحاظ کیا جائے تو اولاد امام حسن اس سے کیوں محروم رہی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسلی امتیاز کا لحاظ نہیں کیا گیا

نوع انسان میں آدم سے لیکر آج تک بیشمار انسان گزرے ہیں لیکن ان لاتعداد انسانوں میں سے صرف چند منصب نبوت پر سرفراز ہوئے، اس کے کیا معنی؟ یہاں بھی یہ حق تلفی نظر آتی ہے۔ عقل کا جواب اس مقام پر یہ ہے کہ غصب حقوق کا اطلاق وہاں ہوا کرتا ہے جہاں کوئی حق پایا بھی جائے اور جب حق کا وجود ہی نہ ہو تو غصب حقوق یعنی چہ! میں اس تحریر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس منصب جلیل کو مقرر کرنے کا اختیار خود رسول کو بھی نہیں تھا، ہاں اعلان

ان کے نفس تبلیغ میں ضرور تھا اور یہ اعلان بطریق شیعہ بذریعہ اہل بیت علی القوا تر ثابت ہے
 فاضل مقالہ نگار نے طعناً لکھا ہے کہ شیعہ تمام دنیا کی آبادی میں دس فیصدی بھی نہیں ہیں۔ اگر یہ تحقیق صحیح مان
 لی جائے تو بھی دس فیصدی بہت ہیں کیونکہ جس فرقے پر صدیوں تک تلوار چلی ہو اور چل رہی ہو اس کا صفحہ عالم پر باقی
 رہ جانا ہی حیرتناک امر ہے۔ بہر حال وہ جتنے بھی شرفائیں اس لئے کہ عوام الناس مصائب میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے
 اس سوال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام دنیوی زحمات کو قبول کیوں کیا؟ کیا ان کے لئے حکومتوں میں منضم ہو جانا ممکن نہ تھا
 یقیناً تھا لیکن ان کی نظر ادا کی فوائد پر نہیں تھی بلکہ وہ دین صحیح اور اسلام صحیح کے طلبکار تھے اور ان کے نزدیک اسلام
 صحیح کی حالت دوسری ہستیاں تھیں۔ لہذا انھوں نے حکام وقت کے مظالم سہے گمراہی کا دامن نہ چھوڑا
 فوج اور بوجہ حضرات کے مرشدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام اہل ادا علی کو جو صاحب مضمون نے خلافت الہیہ
 کا کرز بنایا ہے۔ یہ شخص ایجا وینہ ہے۔ اسی طرح آغا خاں اور ملا خاں سیدنا الدین کی تسلیم جو کچھ ہو۔ عقیدہ خلافت الہیہ
 اس کا دامن دار نہیں

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ کے ظہور کا سبب کیا ہے؟ ناظرین غور فرمائیں کہ روس میں
 بالشوزم کی بنیاد کیوں پڑی؟ ظاہر ہے کہ شاہان روس کے مظالم بالشوزم کی ظہور میں آنے کا سبب ہیں۔ اگر عوام امن و
 سکین کی زندگی بسر کریں، مظلوم کو ظالم کی طرف سے کھٹکانہ ہو۔ عدالت صحیحہ کا دور دورہ ہو تو بغاوت کے جراثیم پیدا ہی نہیں
 ہوتے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ابن آدم کا یہ فطری حق ہے کہ امن و آزادی کی تدبیریں سوچے۔ اس وقت کی اسلامی حکومتوں
 پر نظر کیجئے۔ ظاہر ہے کہ وہ مخصوص من اللہ تو تھیں نہیں اور ظلم و استبداد دنیا میں پھیل رہا تھا اس لئے ایک جماعت
 نے ان سے گلو خلاصی کی کوشش کی

وہ ہستیاں جو مخصوص من اللہ تھیں انھوں نے تو ہمیشہ صبر و سکوت کا حکم دیا نہ خود ان امور میں حصہ لیا اور نہ
 کسی کو اجازت دی لیکن یہ صبر و حلم ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا جس کا پیمانہ صبر کمزور ہو جاتا تھا اور حکومت کے خلاف اٹھتا تھا
 اور اپنی جان دیدیتا تھا۔ علویین، سلاطین وقت کے خلاف اٹھے اس کا راز یہی ہے اور اس معاملہ میں وہ قطعاً معذور تھے۔
 چنانچہ زبیر بن علی اسی جذبہ کے تحت حکومت کے خلاف میدان میں آگئے اور حضرت ابو عیینہ گویا ان کے خاص معاونین میں
 سے تھے (اگرچہ انھوں نے عین وقت پر عذر کر دیا) آئمہ اہل بیت جو ان حضرات کو روکتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ انکی حقیقت
 میں نگاہیں انجام کو جانتی تھیں

سب جانتے ہیں کہ جب دنیا سے حق و ناحق کا امتیاز اٹھ جاتا ہے تو ہر نوع کا انتشار و اغماض پیدا ہونا شروع ہو جاتا
 ہے یہی ان موقعوں پر بھی ہوا وہ لوگ جو ان سلطنتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کی نظریں علویین اور فاطمیین کی
 کی ناکھ میں تھیں اور وہ ایک نئے اور کامیاب ذریعہ کی جستجو کر رہے تھے پھر چونکہ ہر ایک انسان کے لئے سبق ہے

کامیابی کا لہذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بڑی دہشت گردانہ جو کام رہے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان حضرات میں سب سے پہلی
سہی لیکن قیادت مذہبی انھیں حاصل نہیں اور تین بڑے گوارا دل کو صحیح مذہبی عظمت حاصل ہے وہ اس میں شرکت نہیں
کرتے اور ان کی عدم شرکت کے باعث سب آگاہ ہیں اس لئے ملک کو کوئی دیکھی ان سے نہیں رہتی اور حکومت یا سانی
مقابل آنے والوں کو زیر کر لیتی ہے

فکر کرنے والوں کے سامنے جب کوئی ایسا "سبب" آجاتا ہے جو ان کے ارادوں میں خائل ہو تو وہ اس کے دور کرنے
کی فکر کیا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عزم کر لیا گیا کہ ایک مذہبی مسند الگ قائم کی جائے تاکہ قائد کا وقار مذہبی حیثیت سے بھی مسلم جو
چنانچہ اسی خیال کے تحت اس تجویز کو عمل میں لایا گیا اور آخر ایسی کامیابی ہوئی کہ بڑی بڑی قہار خلافتوں کے بنائے ہوئے ہیں
فرقہ باطنیہ کی بنیاد قائم ہوئی جس کے ہاتھوں بڑے بڑے حکام قتل ہوئے۔ اب انھیں کو سا جاتا ہے۔ لیکن بالشوکیوں نے
روس کے شاہی خاندان کا جن جن کے خاتمہ کیا تو اس پر کسی نے آہ بھی نہ کی بلکہ اشتراکیت کو سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ جس روح
کے تحت زار روس تباہ ہوا اسی کی بناء پر بڑے بڑے ملاقہ ہوئے جو فی الحقیقت عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ظالمانہ
حکومتوں کے ایجنٹ تھے

اہل نظر انصاف فرمائیں کہ ایسے فرقوں کی پیدائش کا سبب ظالمانہ حکومتیں ہیں یا عقیدہ خلافت الہیہ
مزید توضیح ملاحظہ ہو۔ اہل سنت کے پاس اتفاق و خلافت کے چار طریقے ہیں:-

- (۱) اجماع یعنی ایک ہم خیال کردہ کامل جمل کر کسی کو حاکم بنالینا۔ ہم خیال اس لئے کہتا ہوں کہ آزاد و واقعی اجماع متفق نہیں
- (۲) استحلاف یعنی جانے والا کسی کے لئے کہہ جائے کہ یہ میرا جانشین ہے
- (۳) شورعی یعنی ایک محدود جماعت کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا
- (۴) قہر و غلبہ یعنی جس کے ہاتھ میں بھی تلوار آجائے اور سلطنت حاصل کرنے

واقعاً جامعیت اسی کا نام ہے یعنی جتنے طریقے بھی حکومت کے ہو سکتے ہیں وہ سب گھیر لئے گئے ہیں۔ کسی قسم کی
بھی حکومت ہو وہ ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جن جن صورتوں سے حکومتوں کا ظہور ہوا ان سب کو
حق مانتے ہوئے یہ اصول تصنیف کئے گئے ہیں۔ گویا حکومتیں کسی اصول کے تحت نہیں بلکہ اصول حکومت کے تحت ہیں۔
یہاں تک شینیت ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور انکی بیعت
سے تقاعد کرنے والا مستوجب جہنم۔ چنانچہ ایسے ہی موقعوں کے لئے یہ حدیث پیش کی گئی ہے:-

"من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتةً جاہلیۃ"

صاحبان غور و فکر سے التماس ہے کہ طرق چہارگانہ جو بیان کئے گئے وہ اصل میں تین ہی ہیں اس لئے کہ اجماع
و شورعی و شورعی کی روح ایک ہی ہے اور یہ تینوں طریقے بلاشبہ متضاد ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان میں اسلامی طریقہ کون سا ہے؟

اگر یہ سب کسی اسلامی حکم کے تحت ہیں تو معاف کیجئے ایک اہم اور اصولی مسئلے میں ایسے متضاد احکام! عقلاً ایسے اسلام کو دوسری سے سلام کرنا چاہئے

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کے آخر میں اپنی تحریر کا خلاصہ درج کر دوں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) اسلام بلا شک و شبہ سعادت بشر کے لئے آیا ہے

(۲) اسی سعادت کا ایک جزو خلافت الہیہ ہے

(۳) خلافت الہیہ ایک موبہت الہیہ ہے وہ کسی نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ جو ہر ذاتی کی بنا پر ہے کسی ایک نسل میں اس کا پایا جاتا اس مفہوم کا حامل نہیں کہ نسلی امتیاز پر نظر رکھا گیا ہے

(۴) خلافت الہیہ سے کسی فرد یا جماعت کی حق تلفی کا ذکر ایک دھوکا ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ فلاں شخص یا فلاں

خاندان اس عطا کا مستحق تھا۔ بغیر اثبات حقوق کے غصب حقوق کہنا ایک بے معنی بات ہے

(۵) اگر غیر مستحق و حیان امامت پیدا ہوئے تو امامت الہیہ اس کی ذمہ دار نہیں

(۶) عقل عمومی کی حجت کا دعویٰ غلط ہے

یہاں تک انسانیت مفروضہ کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب قرآن و احادیث کی طرف توجہ کی جاتی ہے

شیعہ اور سنیلوں میں ایک اصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ شیعہ ہر مسئلہ کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں بر خلاف اس کے حضرات اہل سنت کا مسلک دوسرا ہے۔ چنانچہ اسی تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شیعہ کے نزدیک "انسانیت" اور

شع ہے اور "اسلام" اور شے

مسئلہ قرآن میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطالب صاف و صریح سمجھ میں بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ ملاحظہ کیجئے یہ کتاب خود اپنے متعلق کیا کہتی ہے :-

"فیه آیات محکمات ہن ام الکتاب و آخر متشابہات"

اس میں بعض آیات محکمات ہیں جو ام الکتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں اور خود قرآن یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت محکم ہے اور فلاں متشابہ۔

اس کتاب میں اجمال بھی ہے۔ مثلاً اقیمو الصلوٰۃ وادوا الذکوۃ۔ نفلت کے لحاظ سے دیکھو تو صلوٰۃ کے معنی دعا

اور زکوٰۃ کے معنی خیر۔ قرآن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ صلوٰۃ سے مراد وہ عبادت ہے جس کے اجزاء تکبیر، قیام، رکوع، سجود۔

تشہد وغیرہ ہیں یا زکوٰۃ سے مراد وہ خیرات ہے جو مذہبی فرض کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ ایک ہر ارشاد ہوتا ہے :-

"ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحا و آل ابراہیم" (خود قرآن کہہ نہیں بتاتا کہ آل ابراہیم سے مراد کل ہیں یا بعض)

دوسری جگہ فرمایا ہے :-

”يقول الذين كفروا لست برسول كفى بالشر شهيداً بيني وبينكم ومن عنده أم الكتاب“

کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے۔ کہہ سہ میرے اور تمہارے درمیان شہادت دینے کے لئے خدا کافی ہے اور شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے۔ یہ صاحب علم الکتاب کون ہے؟ قرآن بظاہر خاموش ہے ایک اور آیت ملاحظہ ہو :-

”انه لقرآن كريم في كتاب مكنون لا يمسه الا المطهرون“

یہ قرآن کریم ہے جو کتاب مکنون میں ہے۔ اسے پیش نہیں کریں گے مگر مطہر۔ وہ کتاب مکنون کیا ہے؟ قرآن ہے۔ یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ ایک ایک قدم پر بھی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ مشکلات تو تفسیر کی حد تک ہیں اب رہی تاویل وہ تو ایک دریا ہے ناپیا یا کنارہ ہے

آیات قرآنی کے سلسلہ میں اعتراضات تحریر فرمایا گیا ہے کہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ نہ سمجھتے۔ اُستاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقہ کے کھولا ہے اور حاشیہ پر پروفیسر ٹکسن کی کتاب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے

پہلے تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تاویل کے معنی ہیں کسی لفظ کو اس کی حقیقت اولیہ کی طرف پھٹانا چاہنا۔ چنانچہ اس مقام پر یہی حقیقت اولیہ مراد لی جاتی ہے اور ظاہر لفظ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مقام پر حقیقت اولیہ بھی ذکر کی جاتی ہے اور ظاہر معنی بھی

مثلاً ”یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْہِم“۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ معلوم ہے کہ ”یَدُ“ یا ”ہاتھ“ سے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہاں ”قوت و قدرت گرفت“ کے معنی مراد لئے جائیں گے اور ظاہر معنی کا قطعاً لحاظ نہ ہوگا

مثال ۲۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ۔ ظاہر ہے کہ نماز کی حقیقت اولیہ رجوع الی اللہ ہے۔ اب یہ معنی بھی ملحوظ رہیں گے اور اس کے مفہوم ظاہری کا بھی لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے متعین فرمادیا ہے کیونکہ بعض ارکان کے خلاف کوئی دلیل عقلی یا نقلی موجود نہیں ہے۔ بلکہ علی التواتر یہی اصول عبارت تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ تاویل کے معنی جو عرض کئے گئے۔ اب اگر اس قسم کی تاویل کا دروازہ شیعوں نے کھولا ہے تو وہ اولوالالباب ہیں۔ صاحب فہم و فراست ہیں۔ لیکن اگر مثال مضمون نگار اپنے خیال میں تاویل کے معنی یہ سمجھ رہے ہیں کہ اصل مفہوم و منشاء کو کھینچ تان کر کچھ سے کچھ بنا دینا تو اس کی تحصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مطالب قرآنی ہر عامی اور ناخبرم کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسی لئے اس کے معلم اول خود رسول اللہ تھے مسلمان مجبور تھے کہ وقت نزول آیۃ رسول اللہ سے اس کا مطالب دریا کریں، دریافت کرتے تھے اور جواب پاتے تھے۔ انھیں جوابات کو تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس تفسیر چھوڑ کر قرآن کو

کافی سمجھنا یا خود ان کے مفہوم متعین کرنا رسول کے مرتبہ مسئولیت سے انکار کرتا ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے؟ آیا تفسیر سے ہاتھ اٹھا لیں یا اس پر عمل کریں؟ اور اگر عمل کریں تو کس کے توسط سے؟ شیعہ دوسری صورت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور توسط کے معاملہ میں ان کی نگاہ اہل بیت پر جمی ہوئی ہے۔
مطالب قرآنی کے متعلق یہ ہے شیعہ نقطہ نگاہ۔ اب میں قایل کی قرآن فہمی پر نظر کروں گا۔ ابتدا سے عنوان میں تشریف لیتے ہیں
”وہ قرآنی آیتوں کی بنا پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علی کی الٰہی خلافت پر
مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں۔“

اس تحریر سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف اتنی ہی آیتیں مدار مذہب شیعہ ہیں۔ خیرائے مطلب کی طرف۔
(۱) ”لینس البربان تا تو الیوت من ظہور ہا و لکن البر من النقی و اتوا بیوت من الٰہا ہا“
(نیکو نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو)۔ تفسیر آیت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت عرب جب حالت احرام میں ہوتے تھے تو دروازوں سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پشت خانہ پر کھڑے ہوتا تھے۔ اسی میں سے آتے جاتے تھے اور اسے جزو دین سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعہ اس رسم پرستی کی ممانعت کر دی

یہ تو وہ حقیقی مفہوم ہر احوال و الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جو اس آیت کی شان نزول پر مبنی ہے۔ لیکن ذرا نظر کو وسعت دیجئے احکام قرآنی کسی خاص مسئلے سے متعلق مواد پر ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں اس قسم کے سارے واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو قوانین اسلامی جن شخص المقام فرمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لئے یہ ہونا پڑے گا کہ اس حکم میں سیدھا راستہ چلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کج روی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ آیت کی تاویل غلط ہی یا صحیح تاویل ہے کہ ہر فن میں ہر علم میں ہر شے میں اسی قاعدے سے داخل ہونا چاہئے جو اس کے لئے معین مقرر ہے اگر عقب سے آؤ گے یعنی خلاف قاعدہ داخل ہو گے تو کچھ استفادہ نہ کر سکو گے۔ یہ ایک بڑا سادہ عقلی اصول ہے اور اسی آیت کے تحت میں آ رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر فن میں داخل ہونے کے لئے اس شخص کے پاس جانا چاہئے جو اس فن کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسی عقلی اصول کی بنا پر بخود کا دروازہ نہ توئی ہے اور راگ کا دروازہ نہ تویا۔ بخود سیکھنے کے لئے بخود کے پاس جائیے اور راگ سیکھنے کے لئے گویئے کے پاس۔ اسی طرح خدا شناسی کا ذوق ہے تو رسول کے پاس جائیے کیونکہ معرفت الٰہی کا دروازہ رسول ہے

اب سوال یہ ہے کہ علم رسول کا دروازہ کون ہے۔ یعنی علم رسول کا باب تو ضرور ہونا چاہئے مگر وہ ایسا کون ہے جو ہر شے سے واقف علم رسول ہو۔ شیعہ یہاں تک تو صرف بحکم عقل آتا ہے اور جب تلاش کا قدم بڑھتا ہے تو اس کی خوش قسمتی سے ارشاد رسول اس کے لئے شعل راہ بن جاتا ہے کہ ”اتماذہ بیتہ العلم و علی بابہا“

اب اس شناخت کے بعد اس کی نظر اس ارشاد الہی پر جماتی ہے :-

”ہیٰ یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یجتزئ ذکر اولی الذین یستوی“

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اس استدلال میں کیا خرابی ہے اور آپ ہی متعین کیجئے کہ آخر عالمِ علم رسول کا عقد کون ہے۔

(٢) "اليوم اكملت لكم دينكم واتممت تلبيةكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام وبنا"

(ترجمہ - آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر لوٹا کر دیا) (نعمت کا ترجمہ احسان اور کیا خوب) اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین اسلام ہو۔)

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "سمجھ میں نہیں آتا اس آیت میں کوئی نسخہ الا یا نقص" ہے جو عین حقیقت ہے۔
 کرنے کی ضرورت ہوئی۔"

بے شک ذرا دور کی بات ہے۔ اس مقام پر پھر کسی اور تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ "الیوم" میں "الف" "لام" کافی نمایاں ہے۔ "الف" "لام" "یوم" کہ جو کچھ ہے اس کا ترجمہ "آج" کیا گیا۔ مگر میں ترجمہ کرتا ہوں "آج کا دن" کہ اصل لفظ کی قوت اسی میں پائی رہتی ہے۔ الغرض الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن کوئی مخصوص دن ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ وہ روز مخصوص کو کتنا ہے۔ ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے اور جب اسی پروگرام کا جزو یا غیر انجام پا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے دن تم نے اس پروگرام سے فراغت پائی۔ یا آج کے دن ہم نے اس کی تکمیل کر دی۔ اسی واسطے کہ پروگرام کی تکمیل کے لیے کچھ دن بعد بلکہ اس کے دوسرے ہی دن "الیوم" کہنا درست نہ ہو گا۔ اسی طرح سے آئندہ مذکور میں نہ صرف الیوم مخصوص بلکہ نبوت کے پروگرام کے جزو یا خیر کی شناخت بھی ضروری ہے۔ اس کی غلط یا نقص نہیں کہتے بلکہ اسے "توکل علی اللہ" کہتے ہیں۔ یہ ارشاد کہ "رسول کریم نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرمایا" کچھ مفید نہیں ہے اسی کو تعریف الجھڑل یا الجھڑل کہتے ہیں۔ لفظ مولیٰ سے جو تعریف کیا گیا ہے۔ میں اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب کچھ کہا جائے تو کس کے سامنے

(س) "وانذر عشیرتک الاقربین وانخفض جناحک" الخ

(ترجمہ۔ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو تنبیہ کر دے اور جو ایمان واسے تیرے ساتھ ہیں ان کے سامنے اپنے ازویجے رکھ
(یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

اب سوال یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل رسول اللہؐ نے کی یا نہیں؟ اگر کی تو کیا کوئی عنوان خاص اختیار کیا یا علیہ عام طور پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ آخر تاریخی حیثیت واقعہ کی کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس مقام پر وعدہ کیا تھا کہ بیعت عسکرہ کے واقعہ پر بحث احادیث میں روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر تمام بحث احادیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔

گرایا پی گئے۔ اگر ڈیٹی نذیر احمد مرحوم زندہ ہوتے تو اس موقع پر ضرور لکھ دیتے کہ ”معلوم ہوا یا فی مرتبہ“
(۴) ”انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وہم راکعون“
(ترجمہ) تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور عجز و انکسار سے
زندگی گزارتے ہیں۔ ”ولی“ کا ترجمہ ”رفیق“ یا کیا کہنا
سوال یہ ہے کہ اگر کسی کے لئے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے اور اسے کسی کی ولایت میں آنا پڑے تو وہاں
ولی کے کیا معنی ہوں گے

اب دوسرے پہلو کو دیکھئے۔ ”وہم راکعون“ کا ترجمہ فرمایا گیا ہے ”اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں“ اب میں
اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ ”داؤ“ کو ”عاطفہ“ نہیں ”حالیہ“ قرار دیتا ہوں اور کہتا ہوں۔ ”وہ زکوٰۃ دیتے ہیں درآئح الیکہ
وہ رکوع میں ہوتے ہیں“ کونسا قانون عربیت اس ترجمہ سے رک سکتا ہے اس طرح اس آیت کے دو ترجمے ہو گئے ایک
وہ جو صاحب مضمون نے کیا ہے دوسرا یہ جو میرے قلم سے نکلا ہے، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ایک ایسا معیار چوبچکی
طرف دونوں رجوع کر کے فیصلہ کر سکیں اگر کوئی معیار نہیں ہے تو پھر معاملہ ابھی مبہم کا مبہم رہیگا
اب میں از روئے مفہوم اس آیت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مفہوم اولین یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک گروہ تو
اولیا کا ہے جس کا سلسلہ خود ذات باری ہے۔ دوسری وہ جماعت ہے جو ”کم“ کی مخاطب ہے جن سے کہا گیا ہے کہ اللہ
و رسول اور ان ان صفات والے لوگ تمہارے ولی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر یہ ولایت مقرر ہوئی ہو
ان کا یقین کے بغیر آیت تشنہ مفہوم ہی رہے گی

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ ”اولیا“ کا طبقہ الگ ہے اور ”مولى علیہم“ کا طبقہ الگ اور طبقہ اول
میں لڑا لڑا کچھ ایسی صفات ہیں جو انھیں دوسرے طبقہ سے ممتاز کر رہی ہیں۔ ورنہ ایک جماعت کو ولی قرار دینا اور دوسری کو
”مولى علیہم“ ایک بے معنی بات ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ طبقہ ثانی میں وہ صفات نہیں ہیں جن کا طبقہ اولی حامل ہے
اب حکم عقل سلیم واجب ہے کہ ”وجہ امتیاز“ کی تلاش کی جائے اور وہ ایسی شے ہو کہ دوسروں میں نہ پائی جاسکے۔
دیکھئے ”الذین آمنوا“ سے کچھ بعید نہیں کھلتا۔ اس لئے کہ ایمان ایک شے مشترک ہے جو کم و بیش ہر مخاطب میں موجود ہو
اسی طرح ”یقیمون الصلوٰۃ“ بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ سب ہی نماز پڑھتے ہیں۔ علی ہذا ”یؤتون الزکوٰۃ“ اداۓ زکوٰۃ سے
بھی کوئی خصوصیت خاصہ ظاہر نہیں ہوتی اس لئے صاحب مضمون کے ترجمے کی بناء پر اس آیت کا کوئی مفہوم صحیح پیدا نہیں ہوا
اور نہ کوئی وجہ امتیاز معلوم ہوتی ہے

برسبیل تنزل زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مفہوم پیدا کرے تو یہی ہوگا کہ جن کا ایمان اعلیٰ درجہ کا ہے۔ جو انتہائی خضوع و خشوع
سے ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں جو ہمیشہ زکوٰۃ دیتے ہیں جو ہمیشہ خضوع و خشوع سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لوگ ولی ہیں ان لوگوں کے

جن کا ایمان ادنیٰ درجہ کا ہے یا صریحاً زانی ہے۔ لیکن مفہوم پھر بھی مبہم کا مبہم رہ جاتا ہے۔ بتایا جائے وہ بڑے ایماندار کون ہیں جو کمزور ایمان والوں کے رفیق ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ ایمان کی کئی بیشی ایک امر باطنی ہے۔ اسی طرح خضوع و شرم و فی السجود ان امور کا کون اندازہ لگائے؟ غرض اس مفہوم کی بنا پر بھی انسان کسی صحیح نقطہ تک نہیں پہنچ سکتا اور فاضل مضمون نگار نے جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی بنا پر آیت گور کھو خدا ہو کر رہ گئی ہے۔

برخلاف انہیں دوسرا ترجمہ ”وہ زکوٰۃ دیتے ہیں در آخر الیکہ رکوع میں ہوتے ہیں“ ایک نہایت صحت و صریح و جہ امتیاز ہے اور یہ شان امتیازی جہاں پائی جائے گی وہیں ولایت مستحق ہو جائے گی۔ اس بات کی پروا نہیں کہ یہ ”امتیاز“ کہاں پایا جاتا ہے؟ ہمیں اصرار نہیں کہ علی ہی اس کے حامل ہیں نہیں۔ البتہ میں ثابت ہو جائے مہربا۔ عمر میں ثابت کر دیکھ قبول۔ لیکن محض اس بنا پر کہ علی میں یہ ”شان امتیاز“ پائی جاتی ہے۔ مفہوم آیت کو بدلنے کی سعی کرنا وراثت کا کام نہیں ہے۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ ”ولی“ کا ترجمہ ”رفیق“ کس بنا پر فرمایا گیا ہے۔ آیا ”ولی“ اور ”رفیق“ مترادف الفاظ ہیں؟ یا لفظ ولایت مشترک ہے۔ اگر مشترک ہے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص کرنے کے لئے قرینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً لفظ ”عین“ کہ ”سورج“ کے معنی بھی دیتا ہے اور ”چشمہ“ کو بھی ”عین“ کہتے ہیں۔ ”آئینہ“ کے لئے بھی مستعمل ہے پس جب تک کوئی قرینہ نہ پایا جائے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ اب بتایا جائے کہ اس آیت میں کون سا قرینہ تھا جسکی بنا پر ”ولی“ کے معنی ”رفیق“ کر لئے گئے۔

(۵) ”یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالہ واللہ یحب من اناس“ (ترجمہ۔ اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے انہیں نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا)

اس آیت کے متعلق خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ مفہوم آیت بجائے خود مکمل ہے۔ شان نزول دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ آئیے اس کا امتحان کریں۔ مفہوم اولین کے لحاظ سے آیت میں جو پہلو نکلتے ہیں۔ قابل ملاحظہ ہیں۔

(۱) ”ما انزل الیک“ جو تیری طرف نازل کیا جا چکا اس سے یہ مفہوم نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ نازل شدہ شے ایک ہے یا کئی ہیں۔ مثلاً زید۔ عمرو سے کہتا ہے۔ ”افعل ما قلت لک“ وہ کہ جو تجھ سے کہہ چکا ہوں ضروری ہے کہ تم مکمل اور محاطیہ کے ذہن میں تو وہ مفہوم موجود ہو لیکن سننے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ تھا کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک کام ہے یا کئی کام ہیں۔ پس ”ما“ کا ترجمہ جو ”وہ چیزیں“ کیا گیا کس دلیل سے؟ یہ ہے پہلے ہی قدم پر لغزش

(۲) اس آیت میں ایک ایسی تاکید کی شان ہے جو تہدید کی حد تک پہنچ رہی ہے

(۳) وعدہ حفاظت ابھی بتا رہا ہے کہ اس میں لوگوں کی طرف سے خوف بھی ہے

(۴) ضروری بات ہے کہ وہ شے جس کی بابت اس شدید سے حکم تبلیغ ملا ہے وہ پہلے نازل ہو چکی ہو اور رسول اسے

چانتا ہو۔ جیسا کہ مثال میں اشارہ کیا گیا

جب تک ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لایا جائے۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ ہاں مکمل ہے مگر ان عقروں کے کھل جانے کے بعد۔ بغیر ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لائے کہتے ہوئے چل دینا کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ بحث تو نہ ہوئی۔ دامن چھڑانا ہوا

یہی شکلات ہیں جو انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شان نزول کی طرف رجوع کرے اور شان نزول کو دیکھ کر جو مطالب پیدا ہوں انہیں پیش کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن سے استدلال نہ ہوگا بلکہ شان نزول یا حدیث سے استدلال رہ جائے گا کیونکہ جس طرح صرف۔ نحو معانی۔ بیان کی قرآن فہمی کے لئے ضرورت ہے اسی طرح شان نزول۔ تاریخ۔ حدیث کی بھی ضرورت ہے یہ سب قرآن فہمی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بہ لحاظ علم معانی و بیان قرآن سے استدلال کرے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ شخص قرآن سے نہیں بلکہ معانی و بیان سے استدلال کر رہا ہے

بحث آیات ختم ہو رہی ہے اور اس اختتام پر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس بحث میں قطعاً کامیابی حاصل نہیں کی۔ سطحی باتوں سے دل بہلانا چاہا ہے۔ جن سے صاحب فکر و نظر کے سامنے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ آیات کی بحث ختم ہو گئی اور مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاحب مضمون نے جس تفصیلی آیات کو غیر واقعی تاویل سمجھا ہے وہ تاویل ہے یا حقیقت۔ اس بحث میں میری جانب سے صرف اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ جو مغالطہ ذہنی مضمون نگار کو ہوا ہے اور مغالطہ منطقی انہوں نے دینا چاہا ہے اس کی اصلاح ہونا ہے ورنہ ان آیات کے رموز و اسرار پر ابھی بحث و گفتگو کی بہت گنجائش ہے۔

باقی

”نگار“ کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۱۲۲) ستمبر ۴۱ - (۱۲۶) جنوری، جون، نومبر ۴۱ رنی پرچہ - (۱۲۷) اپریل، مئی و جون ۴۱ رنی پرچہ
(۱۲۹) دسمبر ۴۱ - (۱۳۰) مئی ۴۲ - (۱۳۱) جولائی تا دسمبر ۴۲ رنی پرچہ - (۱۳۲) فروری تا دسمبر ۴۲
(۱۳۵) اپریل، ۴۲ رنی پرچہ - (۱۳۳) فروری - جولائی و اکتوبر ۴۲ رنی پرچہ - (۱۳۴) مارچ ۴۲ - (۱۳۵) نومبر ۴۲ - (۱۳۶) فروری - مارچ - اپریل - جون - نومبر و دسمبر ۴۲ رنی پرچہ - (۱۳۷) مارچ - اپریل - مئی - جون - جولائی - اگست - اکتوبر - نومبر و دسمبر ۴۲ رنی پرچہ

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آپ نے بیدل کا یہ مصرعہ سنا ہوگا:-

پیشم واکردن زمین تا آسماں آغوش داشت

اس کا صحیح مفہوم کل رات سمجھ میں آیا جب ایک شخص کی زبانی آپ کی آمد کا حال سن کر عجیب قسم کا پر لطف صدمہ دل کو پہنچا لطف تو اس احساس سے متعلق تھا کہ آخر کار آپ یہاں آ ہی گئے اور صدمہ یوں کہ آپ نے مجھے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ آنے کی خبر ہی کر دیتے، میرا بانی کی تمنا تو خیر میں کیا کر سکتا تھا اور کرتا بھی تو کس توقع پر؟

معاف کیجئے، بیدل کا وہ مصرعہ مجھے آخر میں لکھنا چاہئے تھا لیکن گھر پر پہلے ہی لکھ گیا۔ اگر آپ اس میں کوئی ترمیم اشارہ التجا نہیں پاتے تو میری قسمت، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میری گرائش و التجا میں کوئی کمی پیدا ہو جائے۔ سوال اگر مہربانی یا مہربانی کا ہوتا تو غالب کی زبان میں کہہ سکتا تھا کہ ”میں کیا وقت نہیں ہوں“ لیکن یہاں تو معاملہ ”وسلے پرورش“ کا ہے۔ کیسی اطلاع اور کہاں کی اجازت

کل صبح آؤں گا اور خواہ مخواہ آؤں گا۔ اس سے مقصود آپ کو اطلاع دینا نہیں، بلکہ اپنے غم میں بھگی پیدا کرنا ہے

خط پہنچا، تم نے کیوں وہ باتیں چھیڑ دیں، جن کے بھلانے کے لئے سو بار دل خون ہو چکا ہے۔ ماضی کی داستان میں لاکھ لڑتیں ہوں، لیکن ان کی یہ تلخی کہ وہ اپنی ٹاپا بیداری سے ہمارے حال و مستقبل دونوں کو بیکار بنا جاتی ہیں، ناقابل پروا شت ہے ایک شاعر لکھتا ہے:-

لسلی و مجنوں بہم می بودہ اندر

پیش ازین خوش روزگارے بودہ است

تم نے دیکھا اس ”خوش روزگارے“ میں زندگی کا کتنا دردناک مرثیہ پوشیدہ ہے۔ مقصود ماضی کی یاد نہیں، بلکہ حال کا ماتم و مستقبل کی سوگواری کا اظہار ہے۔ میں نے ایک عمر جذبات کی دنیا میں صرف کی اور آخر کار نتیجہ میں یہی کہنا پڑا کہ:-

”اسے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا“

پھر کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ سخت امتحان کوئی اور ہو سکتا ہے کہ پیدا تو کیا "اسے خیال پرست" اور مطالبہ ہے
علی زندگی کا۔ میرحم و ظالم عمل!

خدا جانے زندگی کی کتنی باتیں اس سوچ میں بسر ہو گئی ہیں کہ "نہوتا میں تو کیا ہوتا"۔ بعض اوقات کہتا ہوں
"کچھ نہ ہوتا"۔ اور کبھی یہ سمجھتا ہوں کہ "یہی سب کچھ ہوتا" پھر نہ اُس میں اپنی عظمت کا احساس ہے، نہ اس میں اپنی ہیبت
کا، بلکہ ایک اضطراری عدم توازن ہے ذہن انسانی کا اور لطفت یہ کہ فطرت نے اس پر اپنی کارگاہ کا توازن قائم کیا ہے!
تعلیل کہتا ہے:-

دریائے خیالیم و نغمے نیست در اینجا
جز وہم وجود و عدسے نیست در اینجا

میں کہتا ہوں، یہ کہنا بھی ایسا ہی ہے
سچ پوچھو تو آپ میں صرف اس امید پر چر رہا ہوں کہ جینے پر اختیار ہوا نہ ہو، مرنے پر تو ہے، اور اسی سے کچھ کہیں
ہوتی ہے

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اس کا میں قایل نہیں

بزدل نواز، گراخی نامہ لا۔ پرسش حال کا شکریہ۔ اچھا ہوں، اس لئے کہ سربلتر اور بدترین سے بہر حال بُرا
اچھا ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان میں ایک چھٹی جس اور بھی ہو جسے "حسن توازن" کہتے ہیں، میں اس میں "حسن تقابل" کا
بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے۔ ایک برہنہ پا اسی لئے جی رہا ہے کہ دنیا میں بہت سے
"آباہ پا" بھی موجود ہیں، خیر، تو وہ باتیں تمہیں نہیں خواہ مخواہ ہیں نے آپ کی رسمی مزاج پر کسی کے جواب میں لکھ مارا۔
اب اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں

آپ سے کیا کہوں، لیکن کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام کسی کی ذمہ داری اپنے سر لینا ہے، اور
خاص کر میرے لئے کہ میں خود اپنے افعال کا بھی جواب دہ بننا پسند نہیں کرتا۔ آپ نے اُن پر جو لطفت فرمایا ہے، وہ قطع نظر اس
سے کہ میں اس کی داد دوں یا نہ دوں، آپ اپنی داد ہے، لیکن اگر اس کی لطافت میں آپ کوئی ثقل پیدا کرنا چاہتے ہیں
تو آپ کی خوشی منطق و اقتصاد، فلسفہ و اخلاق، مذہب و سیاست سبھی کچھ موجود ہے، ان میں سے ہر ایک کے زاویہ نگاہ
سے تبصرہ فرمائیے اور دیکھئے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ مناسب تھا یا نہیں۔ نیکی کرنے کے بعد اتنی فرصت کہ انسان اس کی
توجیہ و تعلیل بھی کر سکے! اب کیا کہوں کہ کیا ہے۔ بہر حال مجھ سے تو آپ کچھ پوچھئے نہیں، جو آپ مناسب سمجھتے ہوں

کچھ میں شکر ادا کرنے میں بھی تجلی ہوں، اور شکایت کرنے میں بھی۔ وہ تو خیر سنایا اخلاقاً کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے، لیکن اس کے لئے زبان نہیں ملتی۔ اس کا سبب غیرت و خود داری نہیں ہے، بلکہ صرف اپنی نااہلی کا احساس۔ وہی — ”ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا“ والا احساس۔ یہ میں نے اس لئے ظاہر کر دیا کہ مبادا کبھی آپ اس کی توجیہ پر اتر آئیں اور خواہ مخواہ مجھ پر رعونت وغیرہ کا الزام قائم کر بیٹھیں۔ — گرمی کو آپ کیا پوچھتے ہیں — ”لگائے نہ لگے اور بچھائے نہ بچھے“

گرمی — دنیا گزشتنی و گزاشتنی ہے۔ اس کا مطلب میں نے یہ سمجھا ہے کہ اگر یہاں کوئی کسی کو بھلا دے تو افسوس نہ کرنا چاہئے۔ لیکن یاد جو اس علم کے بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی فراموشکاری پر افسوس بھی ہوتا ہے اور شکایت کرنے کو بھی چاہتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے آپ کو کبھی اسی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسی لئے حیران ہوں کہ آپ کی یاد آدري پر شکایت کروں یا شکر! مرسلہ مقالہ اچھا ہے لیکن یہ تو بتائیے کہ انگریزی کے کس مضمون سے لیا گیا ہے۔ مترجم صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ اگست کے شمار میں شائع ہوگا

اللہ، اللہ، یہ اہتمام اور ”ایک جان ناکوں کے لئے“ اچھی غصب کر رہے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ افکار ناکوں سے لیکر اس وقت تک تو تمہارا جواب پیدا ہوا نہیں۔ آئندہ ہو تو ہو۔
✓ تمہیں معلوم ہے کاروبار محبت میں سب سے زیادہ نازک موقعہ کونسا ہوتا ہے؟ وہ، جب انسان ترک محبت کی راہیں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ تو کیا وہ واقعی ایسا کرنا چاہتا ہے، نہیں، بلکہ یہ عزم و ثبات ہے اس قسم کا جو خود کشی کے ارادے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ خود کشی سے جان تو بلی جاتی ہے، لیکن ”ہستی“ اور ابھرتی ہے۔ پھر مجھے سمجھاؤ کہ قصود کیا ہے۔ مصائب روحانی سے چھوٹ جانا؟ تم تو نہ ہی انسان ہو اور ایسے سخت قسم کے کہ صرف روح کی بقا کے قابل ہو، بلکہ یہ بھی کہ ٹوپی شیر وانی سمیت وہ اپنی تصویر بھی کھینچ لیتی ہے۔ پھر تمہیں کیونکر یقین آیا کہ اس زندگی کے بعد تمہاری روح کو چین مل جائے گا جبکہ اس کے تمام احساسات اور زیادہ قوی ہو جائیں گے۔ اچھا یہ نہ ہو تو کیا تمہارا دعا ”لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ کرنا ہے“؟ میں جانتا ہوں اس کے جواب میں تم ہاں نہ کہو گے، کیونکہ کہتے ہو یہ غسی میں اڑا دینے کی بات ہے۔ پھر کیا رعب کا ٹھنڈا چاہتے ہو؟ — دیکھو اسکے جواب میں حسب معمول میر کا یہ شعر سنانا
کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میر، سر پر آستان مارا گیا

جس سے تمھاری عاشقانہ مکاریوں کی پردہ پوشی ہو جائے۔ میں تمھاری فطرت، تمھارے ذوق اور تمھاری حسن پرستیوں سے
 اچھی طرح واقف ہوں۔ کیوں بیوقوف سمجھتے ہو۔ دنیا اب بہت ہوشیار ہو گئی ہے، اتنی ہوشیار کہ عشق و عاشقی کا ادراک
 بھی بالکل سائنٹفک صورت اختیار کر لی ہے۔ عشق و عاشقی کے اب وہ پرانے طور کا کام نہیں دیتے۔ پہلے عاشق محبت
 میں اپنی جان دیتا تھا، اب دوسروں کو ذبح کر ڈالتا ہے، پہلے جنگلوں میں خاک چھانتا تھا، اب پارکوں میں ٹہکتا ہے
 پہلے جیب و گیمباں چاک کر ڈالتا تھا، اب کالروٹائی کی درستی میں مصروف رہتا ہے، پہلے ”خون دل“ پیتا تھا اور
 ”نخت جگر“ کھاتا تھا، اب شراب پیتا ہے اور کباب کھاتا ہے۔ پھر تمھیں بتاؤ کہ اس زمانہ میں کیونکر کسی کو یقین آئیگا کہ
 بتاؤں میں ایک فریاد پیدا ہوا ہے، جسے اگر شیریں نہ ملی تو سر پر پیشہ مار کر مر جائے گا!
 ہاں، اُن سے میں مل چکا ہوں۔ لیکن کیا بتاؤں کہ میں نے انھیں کیا پایا۔ یہ اس قسم کی عورتوں میں سے ہیں کہ اگر
 انھیں کس نہ سمجھ کر ملو تو اچھی خاصی جوان معلوم ہوتی ہیں اور جو ان سمجھ کر ملو تو کس نظر آتی ہیں۔
 اس خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے میں خود تم سے آکر لوں، لیکن اتنا سمجھائے دیتا ہوں کہ اس
 ”طوفان فوج“ لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

دوا شک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

سنئے، صاحب - میں اس

”چشم سوئے فلک بروئے سخن سوئے تو بود“

کا قائل نہیں۔ مگر ادھر ہے تو آنکھیں بھی ملائیے۔ یہ ”دل جائے دیگر ست و نگہ جائے دیگر ست“ کچھ نہیں۔ میں بولا کہتا
 ہوں اور ہر بلا سنتا چاہتا ہوں

میں اُن سے زیادہ خوش ہوتا ہوں جو میری ہاں میں ہاں نہیں لاتے۔ میں کوئی کہانی نہیں کہتا کہ صرف ”ہونہ، ہونہ“
 کرنے والے درکا ہوں۔ میں نشتر چھوڑتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ اس کے جواب میں ”دشنہ و خنجر“ سے کام لیا جائیگا
 یہ عورتوں کی سی ”کراہ“ مجھے پسند نہیں۔ شیر کی ڈکار کا جواب شیر کی گرج سے دیجئے۔ صرف کو سننے اور بد و عادی سے کہیں
 کام چلتا ہے

سلاوہ اس کے یوں بھی، علم و عقل کا اقتضایہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی پر ہے تو آپ اس کی اصلاح کریں،
 اسے سمجھائیں۔ اندھے کو راہ بتائی جاتی ہے۔ گڑھے میں نہیں ڈھکیلا جاتا۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ اس بحث
 کو نگار ہی میں چھیڑیں گے

حضرت، یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں خفا ہوں۔ میں! خفا!! اور آپ سے!!۔ ان تین باتوں کا اجتماع عقلاً محال ہے۔ یعنی اگر کوئی کہے بھی تو آپ کو یقین نہ کرنا چاہئے۔ بیشک اس دوران میں بارہا وہی جانے کا اتفاق ہوا، لیکن آپ وہاں تھے کب، آخری بار گیا تو معلوم ہوا کہ وہی چار روز ہوئے آپ ولایت سے واپس آئے ہیں، لیکن یہ اطلاع مجھے اس وقت ملی جب یہاں ”چل چلاؤ“ لگ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی جاتا ہوا نہیں۔ البتہ اگر آپ یہ شکایت کریں کہ اس کے بعد میں نے کیوں جستجو نہیں کی، تو بیشک میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا، گو میری طرف سے اسی قسم کی شکایت کے آپ کے پاس سو جواب موجود ہوں۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔ آئیے کیوں نہ اب نئے سرے سے تجدید محبت کریں

مخلص نواز۔ آپ کیا پوچھتے ہیں، یہ حادثہ کتنا بڑا ہے۔ میں دوپہر کو حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے ایک عہدہ دار تشریف لائے اور کہا کہ ”اقبال کا انتقال ہو گیا ہے اور شام کو ریڈیو اسٹیشن پر آپ کو اس حادثہ کے متعلق ایک تقریر نشر کرنا ہے۔“ میری عمر میں بہت کم واقعات ایسے ہیں، جنہوں نے مجھے اچانک صدمہ پہنچایا ہو سکتا ہے دماغ چکرانے لگا، پیشانی پر پسینہ آگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے تیز روشنی گل کر کے دفعتاً اندھیرے میں ڈال دیا ہے میں مرحوم سے اول اول سنا۔ میں ملا تھا اور وہیں لاہور میں۔ ملاقات بہت مختصر تھی، لیکن تاثرات کے لحاظ سے بہت کامیاب۔ اس کے بعد بھی چونکہ عرصہ تک میرا قیام لاہور میں رہا اس لئے بارہا عارضی کی فرصت نصیب ہوئی اور ہر مرتبہ انکی شاعرانہ عظمت ایک نئے انداز سے میرے دل میں گھر کرتی گئی

آپ ”صدیاں“ کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ بھی پُر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے پہلے کب کسی کی جگہ پُر ہوئی ہے کہ اب ہوگی۔ سعدی، ہومر، شیکسپیر، فردوسی، بیدل، ہمیشہ ایک ہی پیا ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال سے زیادہ شہرت قبول کسی اور شاعر کو نصیب ہو جائے، لیکن اقبال کی جگہ ہر ستور خانی نظر آئے گی۔ میں نے نگار میں اس حادثہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا کیونکہ رسمی باتوں سے مجھے نفرت ہے اور اقبال کے لئے حقیقی معنی میں صعب آتم بچپانے کے لئے کافی وقت، کافی دماغ اور کافی کاوش کی ضرورت ہے۔ پھر یہ کہ اقبال پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ میں چاہوں بھی تو کوئی اضافہ اس میں نہیں کر سکتا اقبال کا پیام جو کچھ بھی رہا ہو اس سے بحث نہیں، لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ کہتا کس زبان میں تھا۔ اُسکی شاعرانہ خصوصیات میں رفتہ رفتہ جو ترقیاں ہوئیں، وہ ثبوت ہیں اس امر کا کہ اس کی شاعری کیسے مفکرانہ تھی، جسے دوسرے الفاظ میں لہجہ نہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال کی موت کو دنیا ”بے وقت“ کہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ”حرب کلیم“ کے بعد، ان کو زندہ درہنہ چاہئے تھا۔ پیدائش کا مقصود پورا ہو جانے کے بعد جینا نہ جینا برا رہتا

بہت سے رسالے اقبال غبر نکال رہے ہیں اور نکالیں گے، لیکن مجھ میں ہمت نہیں۔ مجھے سو گواریاں خاموش ہی

زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہیں

سیاست یورپ

(۵)

(جنگ جہشہ)

مسلوینی نے اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جہشہ کے خلاف جارحانہ اقدام کیا اور بجائے اس کے حسب شرائط معاہدہ وہ جہشہ کی اعانت کرتا اس کی نارتگری میں مصروف ہو گیا

مسلوینی عرصہ سے مشرق کی طرف تاک لگائے ہوئے تھا۔ کبھی وہ ٹیونس کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور کبھی اناطولیہ کی طرف، کیونکہ اٹالیہ کو وسیع کرنے کے لئے اسے مستعمرات کی ضرورت تھی، لیکن چونکہ یورپ واقف تھا کہ گیدڑ پھپکی اس کی عادت ہے اس لئے اس کی کسی بات کو اہمیت حاصل نہ تھی

پھر اس نے اپنی دھمکیوں کو پورا کر دکھانے کے لئے ۱۹۳۵ء کا انتخاب کیوں کیا، اور جہشہ سے کیوں اس کی ابتدا کی، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے اٹالیہ کی اقتصادیات کا مطالعہ ضروری ہے

اٹالیہ کی آبادی ۴۰ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے تو فرانس کے برابر لیکن رقبہ اس سے بہت کم ہے۔ آبادی میں ہر سال ۵۰ لاکھ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ آبادی کا ۱۰ فی صدی حصہ کاشت پر زندگی بسر کرتا ہے (باقی ۹۰ فی صدی صنعت و حرفت پر) ۲۱ ویں صدی وہاں کے لوگ جاہل ہیں۔ خام پیداوار (مثلاً ربر، ٹین، نکل، ابرک، کرومیم وغیرہ) مفقود ہے۔ روئی، ایلن، کوئلہ، لوہا، تانبہ وغیرہ تقریباً ۹۵ فی صدی باہر سے آتا ہے۔ غلہ کی پیداوار ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ گوشت بھی ۵ فی صدی باہر سے آتا ہے اور (جاپان کو چھوڑ کر) کوئی ملک ایسا نہیں جس کے مدد و سواصل پر اتنی آسانی سے حملہ ہو سکتا ہو جتنا اٹالیہ کے سواصل پر۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک کے لئے جو قدرت کی طرف سے اتنی دشواریاں اپنے ساتھ لایا ہے، مسلوینی کی یہ کوشش کردہ دنیا کی بڑی زبردست قوت بن جائے معمولی بات نہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ کوشش بہت ہنگامی پڑ رہی ہے

اس نے ٹیکس میں اضافہ کر کے قومی آمدنی کا ۳۸ فی صدی تولے لیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کو سخت صدمہ پہونچا اور ۱۹۳۵ء کے بجٹ میں آمدنی دس کروڑ پونڈ سے زیادہ گھٹ گئی لیکن چونکہ ڈکٹیٹر شپ میں اقتصادیات کا مسئلہ بھی

سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے اور اس کے عام اصول بیکار ہو جاتے ہیں، اس لئے اطالیہ کی ساکھ کسی کیسی طرح قائم رہی اور جنگ جیشہ میں تین کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ صرف کرنے کے بعد بھی وہ بدستور زندہ و سلامت موجود ہے۔ بہر حال اس میں کلام نہیں کہ اطالیہ کی اقتصادی حالت عرصہ سے نازک ہے اور ہو سکتا ہے کہ جیشہ پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو لیکن اسی کے ساتھ بعض اور محرکات بھی شامل تھے۔

لوگوں کو لندن کے اس خفیہ معاہدہ کا علم ہو گا جو گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اطالیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اطالیہ سے کہا گیا کہ اگر وہ جرمنی کے خلاف اتحاد میں اس کا ساتھ دیا تو مال غنیمت کا بڑا حصہ اس کو دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اس لالچ میں آگیا اور جنگ میں شریک بھی ہوا، لیکن نتیجہ وعدہ و امید کے خلاف نکلا۔ اسی کے ساتھ مسوینی کی خارجہ پالیسی کو بھی دیکھئے کہ وہ کس قدر ناکام رہی۔ فرانس نے یونٹس کی طرف سے اسے بائوس کر دیا، البانیہ میں اس کا اقدام غیر مفید ثابت ہوا، عربوں کے ساتھ جنگ کرنے میں اس نے غلط فرق کا ساتھ دیا۔ اور دول بلقان میں باہم اختلاف قائم رکھنے کی کوشش اس نے ناکام رہی کہ جگوسلیویا، رومانیہ، ترکی اور یونان میں باہم گرم معاہدہ ہو گیا۔ آسٹریا اور ہنگری پر البتہ وہ اپنا اثر قائم کر لیا لیکن اب کہ جرمنی نے اس پر قبضہ کر لیا ہے، یہ بھی باقی نہیں رہا۔

اطالیہ کی اقتصادی اور سیاسی حالت آپ نے سن لی، اب اسی کے ساتھ آپ مسوینی کی ذہنییت کو بھی سامنے رکھئے۔ مسوینی تمام ڈکٹیٹروں کی طرح اقتدار پر جان دیتا ہے اور کچھ نہ کچھ اسے کرنا ضرور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سیاسی اقدامات نہایت خطرناک ہیں، وہ اچھی طرح واقف تھا کہ جیشہ کی ہم نہایت دشوار ہے، وہ خوب سمجھتا تھا کہ بحرہم میں اس کے سوا حل ہر وقت برطانیہ کے گولوں کا آماجگاہ بن سکتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے قوی اقتدار کو بھی ہاتھ سے دینے پر آمادہ نہ تھا اور اطالیہ کی تمام گزشتہ مایوسیوں اور ذلتوں کا انتقام لینے کے لئے بے چین تھا۔ اور چونکہ جیشہ ہی ایک ایسا ملک تھا جو دول یورپ کی مستعمراتی دست برد سے اس وقت تک محفوظ رہا تھا، اس لئے اس نے اسی کو اپنا نشانہ بنایا۔ اس جگہ یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ برطانیہ اور فرانس کی دستبرد سے جیشہ کیونکر محفوظ رہا۔

بات یہ ہے کہ اول تو جیشہ کی سرزمین ایسی ہے جہاں کوئی یورپین قوم مستقل طور سے آباد نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ حصول دولت کے فطری ذرائع وہاں بہت مہموم ہیں اور پھر یہ کہ وہاں کے جنگجو وحشی قبائل سے سربراہ آسان نہیں تاہم دول عظمیٰ کی مداخلت سے یہ ملک آزاد رہا اور ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۷ء تک برطانیہ اور اطالیہ دونوں وہاں اپنا حلقہ اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اطالیہ کو تو خیر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا لیکن برطانیہ کامیاب رہا کیونکہ لسانا جھیل اسی کے تصرف میں تھی جس سے سوڈان اور مصر میں آبپاشی ہوتی ہے۔ بہرچند ۱۹۱۷ء میں جیشہ کی آزادی کو اطالیہ نے تسلیم کر لیا تھا لیکن فرانس، برطانیہ اور اطالیہ نے باہم معاہدہ کر کے اس کو اصولاً تین حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ یہ جنگ عظیم سے پہلے کی ملوکانہ پالیسی تھی جس کے خلاف جیشہ نے صدائے احتجاج بھی بلند کی، لیکن بیسود ثابت ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں جو خفیہ معاہدہ لندن میں ہوا (اور جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) اس کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر فرانس و برطانیہ، افریقہ میں مستعمراتی توسیع کریں تو اطالیہ کے ساتھ یہ رعایت ملحوظ ہوگی کہ اس کے مستعمرات (اٹریٹیا سوہالی لینڈ - لیبیا) کی حد بندی کے متعلق اس کی موافقت میں فیصلہ کیا جائے گا

۱۹۱۳ء میں حبشہ، لیگ اقوام کا ممبر ہوا اور فرانس و برطانیہ کی حمایت و اعانت پر بھروسہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں مسٹر چمبرلین (وزیر اعظم برطانیہ) اور مسولینی میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے دونوں نے طے کر لیا کہ حبشہ کے کس حصہ میں کس کا کتنا اثر تسلیم کیا جائے گا۔ برطانیہ جھیل ٹسائیا میں ایک بندر بنانا چاہتا تھا اس لئے مسٹر چمبرلین نے مسولینی کو اس پر راضی کر لیا کہ اگر وہ اس میں دخل نہ دے گا تو برطانیہ حبشہ کے مغرب میں اطالوی اثرات کو تسلیم کر لے گا اور اٹریٹیا سے سوہالی لینڈ تک جو جدید ریلوے لائن وہ نکالنا چاہتا ہے اس کی حمایت کرے گا۔ لیکن یہ معاہدہ علی صورت اختیار نہ کر سکا کیونکہ شاہ حبش نے جنیوا کے اجلاس میں اس کی سخت مخالفت کی اور یہ معاہدہ ختم ہو گیا

۱۹۱۵ء میں اطالیہ نے حبش سے ایک دوستانہ معاہدہ کیا اور ہر ایک نے دوسرے کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد سات سال تک کوئی بات ایسی پیدا نہ ہوئی کہ اس معاہدہ کو توڑا جائے، آخر کار ۱۹۳۵ء آیا اور مسولینی نے اپنی پہلی ضرب استعمال کی

۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو دلو ال کا سرحدی جھگڑا شروع ہوا، حالانکہ وہ حدود سوہالی لینڈ سے سوہالی حبشہ کے اندر واقع ہے۔ اس نزاع کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک کمیشن نے (جو انگریزی و حبشی ممبروں پر مشتمل تھا) بمقام دلو ال ایک اطالوی فوجی دستے کو خیمہ زن پایا۔ یہ دیکھ کر انگریز تو واپس گئے، لیکن حبشیوں نے اس سے جنگ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۲ اطالوی اور ایک سو دس حبشی سپاہی مارے گئے

مسولینی (جس نے فی الحقیقت یہ جھگڑا اسی لئے کی تھی کہ لڑائی کو بہانہ بنا کر آجائے) آپے سے باہر ہو گیا اور شاہ حبش سے مطالبہ کیا کہ وہ معافی چاہے، اطالوی جھنڈے کو سلامی دے اور ۲۰ ہزار پونڈ تاوان ادا کرے، لیکن حبش امپریٹریٹ نے ہوا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے

مسولینی نے یہ سمجھا تھا کہ برطانیہ اس کے اقدام کی مخالفت نہ کرے گا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ برطانیہ کچھ زیادہ موافق نہیں ہے تو جنوبی ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے دوبارہ برطانیہ سے گفت و شنید کرنا چاہی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ برطانیہ معاملہ کو لیگ اقوام پر چھوڑ رہا ہے اور اس کے خلاف تجارتی ناکہ بندی کی تجویز ہو رہی ہے تو وہ پھر گیا اور اسے لیگ سے علیحدہ ہونے کی دھمکی دیتے ہوئے، سہرا کتیر کو حبشہ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت اس نے مارنگ پوسٹ کے نائبہ کو جو بیان دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مسولینی کے دل میں کیا تھا۔ اس نے کہا کہ "اب ہم سے یہ کہنا کہ لڑائی سے باز آئیں بہت بعد از وقت ہے۔ پرتگال کو دیکھو، ہنگیم اور لینڈ کو دیکھو، ان میں سے کون ایسا ہے جو زرخیز مستعمرات کا

والکس نہیں۔ یقیناً اطالیہ کو بھی ایسی ہی مستعمرات ملنا چاہئے اور جس وقت ہمیں اس میں کامیابی ہوگی، تو ہم بھی دیکھیں
 ہی صلح پسند ہو جائیں جیسے اور ممالک ہیں۔ نیویارک کے اخبار سن (New York Times) سے اس نے کہا کہ۔
 ”ہم یہ کیوں ان باتوں کا التزام لگایا جاتا ہے جو خود تمھارے لئے جائز ہیں، جب تمھارے اغراض تم کو مجبور کر سکتے ہیں تو
 کبھی جنگ سے پس و پیش نہیں کرتے، لیکن ہمارے لئے ایسا کرنا جرم ہے۔“ ایک بار اس نے اپنی تقریر کے دوران
 میں کہا کہ ”تقدیر کا پہلیا اب منزل تک پہنچنے کے لئے گردش میں آگیا ہے اور اب اس کو نہیں روکا جاسکتا۔“

اسے سب سے زیادہ غصہ برطانیہ پر تھا۔ وہ یہ دیکھ دیکھ کر جل رہا تھا کہ برطانیہ خود تو ایک چوتھائی کرہ ارض پر
 قابض ہے اور ۵۵ کروڑ انسانوں پر حکومت کر رہا ہے لیکن اطالیہ کو اس کی بھی اجازت نہیں دیکھائی کہ وہ جیشہ اپنے
 حقیر اور اجازت شدہ زمین پر تصرف ہو جائے۔ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان پر کیونکر قبضہ کیا، وہ جانتا تھا کہ
 جنگ بوسری میں برطانیہ نے کیا کیا، وہ واقف تھا کہ اس نے جاپان کو کیوں منچوریا پر قابض ہو جانے دیا۔ مگر کاندھرا اسکی
 ریشہ دو انیاں، عدن کا الحاق، ایران کے معاملات میں اس کی مداخلت، جنگ کریمیا میں روس کے خلاف ترکوں سے
 اتحاد، قبرص کا قبضہ، سوڈان میں لوکانہ اقدام، یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات برطانوی تصرفات کے اسے معلوم تھے
 اور وہ اندر ہی اندر کہہ رہا تھا کہ خود اپنے حرکات کو تو برطانیہ دیکھتا نہیں اور اطالیہ کی مخالفت میں لیگ اقوام کو ہانا
 ڈھونڈ رہا ہے

اعلان جنگ کے بعد برطانیہ نے یہ سوچا کہ اگر اطالیہ میں اسباب حرب کی درآمد ہو کر دیکھ جائے، تو ممکن ہے، جیشہ
 کی جان بچ جائے، لیکن اول اول سب سوچ بچار ہی میں پڑے رہے اور آخر کار جب مسولینی نے ایک لاکھ فوج جیشہ
 میں آمادہ دی تو ان کے کان کھڑے ہوئے اور ناکہ بندی کے لئے بحر روم میں جنگی جہاز جمع ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ
 مسٹرائیڈن نے اقتصادی ناکہ بندی کی بھی تجویز پیش کی، اور اس طرح مسولینی کا غصہ اور بڑھتا گیا

حقیقت یہ ہے کہ لیگ اقوام کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب برطانیہ کی پالیسی تھی، جو ایک طرف یہ بھی چاہتا تھا کہ
 اطالیہ جیشہ پر قابض نہ ہونے پائے اور دوسری طرف وہ اطالیہ سے لگاؤ نا بھی مناسب نہ جانتا تھا۔ کیونکہ اندیشہ یہ تھا کہ
 اگر اطالیہ لیگ اقوام سے علیحدہ ہو گیا تو یقیناً جرمنی سے مل جائے گا۔ اس وقت لیگ کے سامنے حقیقتاً اطالیہ اور جیشہ کا سوال

۱۸۷۱ء سے برطانیہ نے جن آزاد حکومتوں پر اپنا قبضہ قائم کیا، ان کی فہرست ملاحظہ ہو۔۔۔ بلوچستان۔ برما۔ قبرص۔ دیہائے دی۔
 ہانگ کانگ۔ کویت۔ سنائی۔ شمالی کائینا۔ جنوبی کائینا۔ مشرقی کائینا۔ جزائر سلیمان۔ جزائر ٹونگا۔ سوڈان۔ اگانڈا۔ برٹش ایسٹ افریقہ۔
 برٹش سومالی لینڈ۔ زنجبار۔ ٹرنسوال۔ آریجن فری اسٹیٹ۔ رھوڈیسیا۔ برٹش سنٹرل افریقہ۔ نامیجیریا۔
 ملاوہ ان کے امراتہ حیثیت سے وہ فلسطین۔ ٹرانس جاردن۔ ٹینگنیکا۔ ٹوگو۔ کیمرون۔ سوڈان و یسٹ افریقہ پر بھی قابض ہے۔

نہ تھا بلکہ جرمنی کا تھا۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی نامناسب ہے کیونکہ اطالیہ کی کمزوری سے ہٹلر کو اتار پادل پھیلانے کا موقع مل جائے گا اور وسط یورپ کا امن و سکون درہم برہم ہو جائے گا، کبھی یہ سوچتے تھے کہ ناکہ بندی ضروری ہے تاکہ اطالیہ کی حالت کو دیکھ کر ہٹلر کو تنبیہ حاصل ہو اور دوسرے ملکوں میں مداخلت کے خیال کو ترک کر دے۔ اسی کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر اطالیہ کو زیادہ سختی کے ساتھ باز رکھا گیا تو ممکن ہے دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو جائے۔ الغرض برطانوی مدبرین اس باب میں مختلف خیال تھے اور اسی لئے مجروحہ میں انکی جنگی جہازوں کی نقل و حرکت اس وقت تک شروع نہیں ہوئی، جب تک بیلیا میں اطالوی فوجوں کے اجتماع سے مصر اور اٹلی کی طرف سے برطانیہ کو خطرہ پیدا نہ ہو گیا۔ اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی کے متعدد اسباب یہ تھے:۔

ایک یہ کہ اگر اس وقت لیگ اقوام نے کوئی موثر کارروائی نہیں کی تو اس کا راسخا اقتدار بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا اگر منجور یا کے مسئلہ میں لیگ اقوام نے جاپان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا تو خیر کوئی بات نہ تھی کیونکہ وہ معاملہ ایک دور دراز ایشیائی حصہ کا تھا، لیکن جیسے جیسے توگو یا گھر کی بات تھی اس لئے اگر اس وقت اطالیہ کی مداخلت کو گوارا کر لیا گیا تو آئندہ جرمنی کو بھی اس کا حوصلہ ہو گا اور یورپ کا امن خاک میں مل جائے گا۔

دوسرے یہ کہ مقبوضات برطانیہ سب کی سب ناکہ بندی پر زور دے رہے تھے تیسرے یہ کہ انگلستان کی لبرل جماعت جو فاسنرم کی دشمن سب مسولینی کو نیچا دکھانا چاہتی تھی چوتھے یہ کہ جب جون ۱۹۴۰ء میں لارڈ سیسل نے لوگوں کی رائے حاصل کی تو معلوم ہوا کہ تقریباً تین کروڑ آدمی اقتصادی ناکہ بندی کے موافق ہیں اور تقریباً پلوں لاکھ اقتصادی و حربی دونوں قسم کی ناکہ بندیاں چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک کی نصف آبادی ایک طرف ہو جائے تو کیونکر اس کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ اس کے ایسٹ لینڈ بھی پوری طور سے ناکہ بندی کی موافقت میں تھی اور جنرل اسمٹھس نے ظاہر کیا کہ جیسے جیسے اطالیہ کی یہ جنگ برطانوی مستعمرات میں گورے اور کالے کی جنگ سمجھی جائے گی جو برطانوی اغراض کے منافی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ مبادا اطالیہ کی کامیابی مصر، بحر احمر، اور ہندوستان کے لئے کوئی خطرہ بن جائے الغرض ناکہ بندی کا فیصلہ کر لیا گیا لیکن بالکل بادل ناخواستہ اور عمل کیا گیا اتنی سست روی کے ساتھ کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اقتصادی یا تجارتی ناکہ بندی تو خیر کچھ ہوئی لیکن اسباب حرب کی درآمد اطالیہ میں برابر جاری رہی اور ہر سویر کو اطالیہ کے خلاف بند کر دیئے کی جو تجویز برطانیہ یا لیگ اقوام نے پیش کی تھی اس پر تو عمل ہوا ہی نہیں۔ ادھر ظاہر ہے تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن اندرونی طور پر کیا سمجھوتے ہو رہے تھے۔ اس کی داستان بھی سن لیجئے محکمہ خارجہ کے ارباب عمل و عقد اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اس جنگ کو کیسے ختم کرنا چاہئے۔ ۸ دسمبر کو سر جموں ہور (برطانیہ کے وزیر خارجہ) پیرس گئے اور وہاں مسٹر لیون سے کچھ گفتگو کی، لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ آپس میں

کیا طے کیا گیا۔ لیکن اتفاق سے فرانس کے اخباروں کو کچھ پتہ چل گیا اور ان کے ذریعہ سے انگلستان کے اخباروں کو بھی معلوم ہو گیا کہ حبش کا ایک حصہ اطالیہ کو رشوت میں دینا طے کر لیا گیا ہے۔ اس سے انگلستان کی پبلک میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اب کاہنہ کو فوراً کچھ نہ بچ کر نا ضروری تھا، اس لئے مسٹر بالڈوین نے فوراً کاہنہ کو طلب کر کے "ہورس لیول" سمجھوتہ کی منظوری دیدی اور اتنی جلدی اس کو طے کیا کہ وزیر کو یہ سمجھنے کا بھی موقع نہ ملا کہ فی الحقیقت اس سمجھوتہ کی نوعیت کیا ہے کہا جاتا ہے کہ اس وقت کمرہ سے نقشے بھی ہٹا دئے گئے تھے تاکہ لوگوں کو یہ سمجھنے کا بھی موقع نہ ملے کہ حبشہ کا کتنا حصہ اطالیہ کو دیا جا رہا ہے

دوسرے دن مسٹر بالڈوین نے الزان وزارت میں ایک تقریر کی جس سے اس سمجھوتہ پر کچھ روشنی پڑتی تھی۔ انہوں نے دوران تقریر میں کہا کہ "اس وقت میرے لبوں پر ٹھہر گئی ہوئی ہے، لیکن جس وقت یہ ہنگامہ فرو ہو جائے گا تو میں تفصیل بیان کروں گا اور مجھے امید ہے کہ کوئی آواز نہ بھی میرے خلاف نہ اٹھے گی۔"

اس بیان نے لوگوں میں حیرت و اضطراب کی لہر دوڑادی اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے یحییٰ ہو گئے۔ سرسبز کی مور ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔ ۱۳ دسمبر کو اس سمجھوتہ کی تفصیل شائع ہوئی، جو لوگوں کے اذیتہ سے زیادہ خراب ثابت ہوئی ۱۴ کو ہورس نے وزیر برطانیہ متینہ حبش کو مارکیجاک شاہ حبش پر پورا اثر ڈال کر راضی کیا جائے۔ لیکن ادھر پبلک کی برہمی برابر بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ مسٹر ایٹکن نے صاف صاف کہہ دیا، فرانس اور برطانیہ دونوں ملکر حبش کو ڈبو دینا چاہتے ہیں، اس کا نتیجہ ہوا کہ حکومت کی موافق جماعت بھی متزلزل ہو گئی، مسٹر بالڈوین پر ہر طرف سے اعتراضات ہونے لگے یہاں تک کہ ٹوری جماعت بھی مخالف ہو گئی۔ اس صورت میں کسی نہ کسی کو قربانی کا بکرا ضروری تھا۔ اس لئے جب سرسبز کی مور سوئٹزر لینڈ سے واپس آئے تو مسٹر بالڈوین نے انھیں کی بھینٹ چڑھا دی، یعنی ان کو وزارت خارجہ سے استعفا دینا پڑا اور یہ سمجھوتہ ختم ہو گیا

۱۹ دسمبر کو ہورس نے دارالعوام میں دینی زبان سے کچھ جواب دی کی، لیکن مسٹر بالڈوین کے لبوں پر جو ٹھہر سکتی تھی وہ نہ ٹوٹی، اسی لئے بعض نے یہ رائے قائم کی کہ استعفا اصل میں بالڈوین سے طلب کرنا چاہئے تھا نہ کہ ہورس سے۔ مسٹر بالڈوین جن باتوں کو ظاہر نہ کر سکتے تھے وہ یہ تھیں کہ اگر اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی کی گئی اور خصوصیت کے ساتھ پٹرول وغیرہ کی درآمد وہاں بند کر دی گئی تو بالکل ممکن ہے کہ وہ خجھلا کر برطانیہ پر بیڑہ چڑھ کر دسے اور اس صورت میں سارے یورپ کے اندر جنگ چھڑ جانا یقینی تھا، اسی کے ساتھ ایک جماعت کا خیال تھا کہ اطالیہ اس جنگ میں ناکام رہے گا اور یورپ کی موجودہ سیاسیات متزلزل ہو جائے گی، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ وہ کامیاب ہوگا، اس لئے مناسب یہی ہے کہ اختتام جنگ سے قبل اس کو حبش کا ایک ٹکڑا دیکر راضی کر لیا جائے۔ ان صورتوں میں مناسب یہی تھا کہ ناکہ بندی وغیرہ کی کارروائی سے قبل ہی اطالیہ کو حبشہ کا ایک ٹکڑا دیکر راضی کر لیا جائے، لیکن یہ تدبیر کامیاب

ہندوئی اور آخر کار ناکرندی شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ کی ابتدا کی بات ہے۔
 مسولینی جو برطانیہ و فرانس کی ترکیبوں کو غور سے دیکھ رہا تھا آخر کار سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نے فوراً اٹالوی سپاہ معہ جدید آلات حرب اور زہریلی گیس وغیرہ کے اس قدر تیزی کے ساتھ حبش پہنچا دی کہ لوگ حیران رہ گئے۔
 نتیجہ جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے۔ ہر مئی کو عدیس با فتح ہو گیا اور شاہ حبش فرار ہو گیا۔
 رہائش لینڈیں، شہر کی کامیابی، حبش میں مسولینی کی فتح اور جنگ اسپین حقیقتاً سب ایک ہی زہریلے درخت کی شاخیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اب ڈیاکریٹک حکومتیں اس کو ماننے لگی ہیں کہ بلا پس و پیش اپنے آپ کو خطر میں ڈالنے بھی بچا ہے خود ایک قوت ہے اور اس قوت کا بہترین مظاہرہ فاسترم اور نازیم کی طرف سے ہو رہا ہے۔
 مسولینی کی کامیابی حبشہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاسسٹ جماعت کے حوصلے بڑھ گئے اور یورپ کے مختلف حصوں میں اس نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا۔

اس وقت یورپ آماجگاہ ہے اس تصادم کا جس میں ایک طرف حق و قانون کی پناہ ڈھونڈھی جا رہی ہے اور دوسری طرف تیغ و تنگ سے فیصلہ چاہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ فیصلہ دشوار ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا اور جلد ہو کر رہے گا۔

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہوں

نگارستان	جمالتان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نور روپیہ
معرکہ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میران کل
دھائی روپیہ	دھائی روپیہ	دو روپیہ	دو روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

راہب

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

راہب اونچے مینار پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔

”لغزش، انسانی سرشت میں داخل ہے، کون ہے جو ان لغزشوں سے مبرا ہے؟ ان کو مٹانا تو درگناہ کا اور آگ بھی مشکل امر ہے۔ کون ہے جو ایک عورت کو دیکھے اور اپنا دین و دل نہ کھو بیٹھے؟ کون ہے جو کسی دوسرے شخص کو دیکھ کر اپنی روحانیت برقرار رکھ سکے“

کچھ سوچ کر آپ ہی آپ کہنے لگتا ہے۔

”یقیناً ہمارے عیسے کو فرد کوئی خطرات عورت ملی ہوگی میں بھی ایسی ہی عورت کو دیکھتا ہوں بتا ہوں، جتنی عورتیں مجھے ملی ہیں سب کی سب شریف خصال تھیں“

پھر پڑھنے لگتا ہے۔

”اے عیسے! اگر تو مسادات و امن چاہتا ہے تو عورت کو طاعون خیال کر، اپنی پوری طاقت سے عورت

دور بھاگ، اُس کے آگے سر نہ جھکا عورت کی سرشت میں داخل ہے کہ مرد کا تعاقب کرے“

اوپر دیکھ کر آپ ہی آپ۔

”میرے مینار کی چوٹی سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن مسیح تو عورت کو بہت سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

غالباً انھیں عورت سے ملنے کا موقع نہ ملا ہوگا“

(مینار کے نیچے سے ایک آواز) راہب! معزز راہب!

راہب۔ کون ہے، مجھے کون بلاتا ہے؟

آواز (نزدیک سے) ایک زائر

راہب۔ کیا زائر ہمارے لئے کوئی ہدیہ لایا ہے؟

زائر۔ ہاں، کھجوروں کی دو ٹوکریاں

راہب۔ صرف دو؟ (کچھ سوچ کر) خیر، اوپر آ جاؤ!

زائر۔ راہب! معزز راہب

راہب۔ (اپنی آواز میں اجنبیت پیدا کرتے ہوئے) معزز نوجوان مینار کے نیچے سے آوازیں دینا کوئی معنی نہیں رکھتا

زائر۔ (دراور اوپر آ کر) لیکن مینار پر چڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں

(وہ مینار پر آ کر راہب کے سامنے گھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک عجیب سی نوجوان ہے اور زائرین کے لباس

میں لبوس ہے)

آپ ہی ہیں معزز راہب! اور یہی ہے آپ کا مقدس مینار (گھٹنوں کے بل جھک کر) کس قدر مبارک ہے

آج کا دن کہ مجھے آپ کی زیارت نصیب ہوئی

راہب۔ نوجوان! اگر تم احتیاط سے کام نہ لو گے تو گر پڑو گے۔ میں کوئی ایسا بڑا راہب نہیں ہوں۔ ہاں تو وہ کھجوروں کے

متعلق تم نے کیا کہا تھا

زائر۔ میں دو ٹوکریاں لایا ہوں۔ (کھڑا ہو کر کپڑوں میں سے تلاش کرتا ہے) ایک یہ اور دوسری۔۔۔۔۔ معزز راہب!

میرا خیال ہے کہ میں دوسری ٹوکری مینار کے نیچے بھول آیا ہوں

راہب۔ (منہ سے) تم بڑے لاپرواہ معلوم ہوتے ہو

زائر۔ میں کل کسی کے ہاتھ بچھ دوں گا

راہب۔ کل تم کیوں نہیں آ سکتے؟

زائر۔ کیونکہ میں ایک راہبہ کارنیلیا کی زیارت کرنے جا رہا ہوں۔ سنا ہے کہ اُس نے تین سال سے کچھ نہیں کھایا۔

راہب۔ (حس سے) تو تم غلطی سے راستہ بھول کر میری طرف آ گئے ہو، ہاں ہاں کارنیلیا کے پاس جلدی جاؤ ورنہ وہ

مرگئی تو تھا۔ بے لگے بہت بُرا ہو گا

زائر۔ لیکن آپ تو کارنیلیا سے زیادہ مشہور ہیں، اسی لئے کارنیلیا کے لئے کھجوروں کی صرف ایک ٹوکری لئے جا رہا

ہوں اور آپ کے لئے دو لایا ہوں

راہب۔ ایک دوسری کا تو صرف وعدہ ہے اور یہ کھجوریں کارنیلیا کے لئے کیوں لئے جا رہے ہو وہ تو کچھ نہیں کھاتی۔

بے افسوس ہے کہ میں نے تم سے کیوں کہا کہ احتیاط کرو ورنہ نیچے گر پڑو گے

زائر۔ (جھک کر) ذرا کے لئے برہم نہ ہو جائے، میں بہت دور سے چل کر آیا ہوں۔ یہاں پہنچنے میں پانچ سال

صرف ہو گئے ہیں

راہب — تم نے راستہ میں کتنے راہبوں کی زیارت کی؟

زائر — جتنے راستہ میں مل سکے، لیکن آپ سب سے زیادہ مقدس و بزرگ ہیں

راہب — (کچھ نرمی سے) مجھے خوشامد کی ضرورت نہیں ہے

زائر — لیکن میں تو بالکل درست کہتا ہوں۔ تمام دنیا میں آپ کی شہرت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو ایک دفعہ دیکھ کر

آپ کو بھلا دینا ممکن نہیں۔ ہزاروں آدمی صرف آپ کی زیارت کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو طیار ہیں۔

راہب — ہاں بہت سے لوگ لیکن وہ اپنی عقیدت کا مظاہرہ کھجوروں کی صرف دو ٹوکریوں سے کرتے ہیں، نہیں بلکہ

ایک سے، اور دوسری صرف وعدہ کی صورت میں

زائر — لیکن میں تو غریب ہوں۔ کھجوریں آپ کے مینار کے نیچے بکتی ہیں! اور وہ کچھ بہت زیادہ گراں قیمت بھی نہیں۔

راہب — ہوں — تو یہ وجہ ہے کہ میرے پاس آج کل کھجوریں ہی لائی جاتی ہیں۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا۔ نوجوان!

اگر تم غریب ہو تو تم نے پانچ سال سفر میں کس طرح صرف کئے؟

زائر — میں نہیں جانتا۔ معزز راہب! دنیا بہت عظیم الشان ہے اور آزادی بہت اچھی

راہب — یہ تو بہت پرانا خیال ہے اس سے۔ تو ظاہر نہیں ہو سکتا کہ تم زائروں کے لباس میں کیوں بیوس ہو

زائر — تمہارے آپ کو معلوم ہو کہ آج کل سفر کرنے کا آسان طریقہ صرف یہ ہے۔ ایک زائر بہت سی چیزیں بغیر قیمت ادا

کئے دیکھ سکتا ہے۔ اگر اُسے قیمت ادا کرنی بھی پڑے تو وہ کچھ زیادہ نہیں ہوتی

راہب — کیا تمہیں کھجوریں بھی ارنال مل گئی ہیں؟

زائر — آپ کے لئے مخصوص کھجوریں ہوتی ہیں جو کچھ کم درجہ اور —

راہب — (غصہ سے) کیا یہ کم درجہ ہوتی ہیں؟ میں اس کے متعلق ضرور دریافت کروں گا۔ میرے الفاظ یاد رکھو

کہ کل تک وہ دوکان یہاں نہیں رہے گی۔ میں اُنھیں کم درجہ کھجوریں رکھنے کا مزہ چکھاؤں گا۔

زائر — میرا خیال ہے کہ آپ کو فی سخت بدعا نہیں دیں گے۔

راہب — خیر، تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ ہاں، تو تم زائریں کے لباس میں اس لئے سفر کرتے ہو کہ تمہارا خرچ کم ہو۔

کس قدر نفرت انگیز عمل ہے۔ اچھا اب تم اس مینار سے جلد اتر جاؤ۔ تم نے اپنی کھجوروں — کم درجہ

کھجوروں کی قیمت سے زیادہ گفتگو کر لی ہے۔ جلد اتر جاؤ اور کار نیلیا کے پاس جاؤ، میں تمہیں کچھ اچھا دینا

زائر — آپ بھی تو اس مینار سے نیچے اترے، دیکھئے موسم بہار میں دنیا کیسی خوبصورت ہو جاتی ہے

راہب — میں خوبصورتی سے نفرت کرتا ہوں

زائر — نہیں، آپ ضرور یہاں سے اتر کر نیچے جائیے اور دنیا کے عجائبات دیکھئے، اگر میں اپنی تمام عمر سفر میں

صرف کردوں تب بھی ان عجائبات کو نہیں دیکھ سکتا

راہب :- میں ان عجائبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا

زائر :- نہیں، آپ غلطی پر ہیں۔ کیا آپ پہاڑوں پر گھوم کر جانے والی سڑک کی خوبصورتی اور دل آویز و دلکش میدانوں کی پرواہ نہیں کرتے؟ کیا آپ اس مینار کے مقابلہ میں وہاں رہنا پسند نہیں کریں گے؟

راہب :- ہرگز نہیں

زائر :- (کچھ وقفہ کے بعد) آپ تمام راہبوں میں سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ میں ایسی قربانی کے لئے طاقت کہاں سے آئی؟ کیا یہ سب کچھ مذہبی یقین نے سکھایا ہے؟

راہب :- اگر تم تمام رات یہاں رہو تب بھی نہیں بتاؤں گا

زائر :- یہ مذہبی یقین ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا

راہب :- کار نیلیا تمہارا انتظار کرتی ہوگی، جاؤ، جلدی جاؤ،

زائر :- کیا آپ اس مینار سے میرے ساتھ نیچے نہیں اتریں گے؟

راہب :- ہرگز نہیں۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا ہوں گا

زائر :- اس کا مجھے یقین نہیں آتا

راہب :- اگر یقین نہیں آتا تو سفر ختم کر دو اور میری طرح مینار پر بیٹھ رہو

زائر :- میرے لئے یہ ممکن نہیں۔ میں آخری سانس تک سفر کرتا رہوں گا

راہب :- اچھا تو جاؤ۔ کار نیلیا کے پاس جاؤ

زائر :- پیشتر اس سے کہ میں جاؤں میرے لئے دعائے خیر کیجئے

راہب :- ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میری دعا کے قابل نہیں ہو

زائر :- جب تک آپ میرے لئے دعائے خیر نہیں کریں گے تب تک نہیں جاؤں گا میں اسے حاصل کرنے کے لئے پانچ سال سے سفر کر رہا ہوں

راہب :- اچھا تو تم بھی میری طرح یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھ رہو

(دور سے باجہ بجنے کا شور سنائی دیتا ہے)

زائر :- یہ کیا؟

راہب :- مجھے کیا معلوم

زائر :- (مینار سے نیچے دیکھتے ہوئے) کوئی جالوس ہے، گھڑے اور سپاہی ساتھ ہیں۔ درمیان میں ایک

سنہری گاڑی بھی ہے یہ جلوس ضرور کسی بادشاہ کا ہوگا

راہب :- (انگریزی لیتے ہوئے) ہوگا

زائر :- مجھے جلد نیچے جا کر اسے دیکھنا چاہیے

راہب :- ہاں جلد جاؤ خدا حافظ

(نیچے اترتے ہوئے) خدا حافظ

راہب :- (انگریزی لیکر ایک کچھرا اٹھاتا ہے اور اسے غور سے دیکھتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد غصہ میں آکر زائر کی طرف پھینک دیتا ہے) بے وقوف! عجائبات دنیا۔ ادھرہ!

کتاب کھول کر پڑھتا ہے :-

”بے وقوفوں کی باتیں مت سنو، ”جواب جاہلاں باشد خاموشی“ پڑھ کر دے

(اوپر دیکھ کر) کتنی اچھی بات کہی ہے! (شور زیادہ قریب آ جاتا ہے) کیا ایسی فضول آوازوں سے مجھے کبھی نجات ملے گی؟ — آہ!

دوبارہ پڑھتا ہے :-

”زندگی آگ ہے جسے عورت بھڑکاتی ہے“

(دوبارہ شور کی آواز سن کر) براہو اس آواز کا میں نہیں چاہتا کہ میرے خیال کی دنیا میں یوں خلل ڈالا جائے (بہت نیچے سے ایک آواز) بادشاہ سلامت کے لئے راستہ صاف کرو

راہب :- دنیا میں کہیں بھی امن نہیں، خیر —

وہ پھر پڑھنے لگتا ہے :-

”عورت صبح کے وقت منتسم نظر آتی ہے اور تمہارا دین و دل لے جاتی ہے، شام تک تمہاری عورت و شہرت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ ستارے چکنے سے پہلے تم تباہ ہو جاتے ہو اور جب —“

شاہی مسخرا :- بادشاہ سلامت کے لئے راستہ صاف کرو

(راہب کتاب بند کر دیتا ہے اور بالکل سیدھا بیٹھ جاتا ہے جیسے کہ عبادت کر رہا ہو)

شاہی مسخرا :- بادشاہ سلامت کے لئے راستہ —

راہب :- تم اس طرح چیخنے کی بجائے بادشاہ کو میٹر ٹھیاں پڑھنے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟

مسخرا :- بادشاہ سلامت —

بادشاہ :- (مینار کے اوپر آکر) بے وقوف تو راہب کے امن میں خلل کیوں ڈالتا ہے؟

راہب :- میں نے بھی اسے چپ ہونے کے لئے کہا تھا
بادشاہ :- اچھا، آپ ہیں معزز راہب اور یہ ہے آپ کا پاکیزہ مینار!

راہب :- ہاں

بادشاہ :- آپ نے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے

راہب :- ہاں

بادشاہ :- کیا آپ کو کوئی دنیاوی خواہش نہیں ہے؟

راہب :- ہاں، نہیں ہے۔

راہب :- یہ کون ہے؟

بادشاہ :- شاہی مسخرا

راہب :- میں سیران ہوں کہ تم اس کی معیت کس طرح برداشت کر سکتے ہو؟

بادشاہ :- بادشاہ کو ہر چیز برداشت کرنی پڑتی ہے۔ معزز راہب شاید آپ ہمیں دولت مند اور خوش نصیب خیال کرتے ہیں

راہب :- نہیں، میں تمہیں بد نصیب سمجھتا ہوں

بادشاہ :- اہ میں بد نصیب ہوں۔ بادشاہ ہونے کی تکلیف سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں موت کو شاہی زندگی

پر ترجیح دیتا ہوں

راہب :- (انگریزی لیکر) کیا آپ کسی ضروری کام کے لئے آئے ہیں

بادشاہ :- میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ مینار چھوڑ کر میرے ساتھ چلیں۔ سوائے اس مسخرے کے میرا

کوئی دوست نہیں، کوئی ایسا نہیں جس پر میں اعتبار کر سکوں اور اسے اپنا دل دکھا سکوں۔ اس لئے آپ

نیچے اتریں اور ہماری مدد کریں۔ مینار کو اسی طرح چھوڑیے اور نیچے آکر ہماری روحانیت کو بلند کیجئے میں آپ کو

کوئی دنیاوی انعام نہیں دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ بھی میری طرح دولت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے

ہوں گے۔ یہ ہے وہ عظیم الشان کام جس کو آپ اور صرف آپ انجام دے سکتے ہیں

راہب :- کیا تمہارا ملک بہت بڑا ہے؟

بادشاہ :- ہاں بہت بڑا

راہب :- کیا تمہارے ملک میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بدی کو دور کر سکے

بادشاہ :- کوئی نہیں۔ میں نے برسوں بے سود تلاش کی۔ لوگوں کے دلوں میں صرف برائی بھری ہوئی ہے

راہب :- میں اس پر یقین نہیں کر سکتا

بادشاہ :- مگر یہ بالکل سچ ہے

راہب :- ہوگا مگر میں مینار سے نیچے نہیں اتر سکتا، میں یہاں نامعلوم مدت تک بیٹھا رہوں گا
(سیرٹھیوں میں سے عورت کی آواز) راہب ! معزز راہب !

راہب :- خدایا، آج میری گلو خلاصی ہوگی یا نہیں۔ عین اُس وقت جبکہ میں بد دعا کرنے لگا تھا ایک عورت آگئی
آواز :- معزز راہب ! ہم اوپر آ رہے ہیں، یہ مینار بہت خطرناک ہے

راہب :- یہاں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

آواز :- میری مالکہ آپ کو دیکھنے کی بہت خواہشمند ہے

راہب :- اپنی مالکہ سے کہہ دو کہ نیچے چلی جائے ورنہ میں دھکا دیکر نیچے گرا دوں گا

پراکلا :- (اوپر آ کر) کیا واقعی آپ زیارت کرنے والی عورتوں کو دھکا دیکر نیچے گرا دیتے ہیں ؟

راہب :- نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہاں ہر ایک وقت چار آدمی نہیں ٹھہر سکتے، جگہ بالکل نہیں ہے
اپنی مالکہ سے یہ کہہ دو

پراکلا :- میری مالکہ اس کو غلط سمجھے گی

راہب :- کچھلے مہینے ایک عورت چار بچوں کو لیکر مجھے دیکھنے آئی لیکن صرف دو کے ساتھ واپس گئی، تم سمجھیں ؟

بادشاہ :- (منخرے سے) اُن کو نیچے اتار دو اور آؤ ہم واپس چلیں

منخرا :- نیچے جاؤ بادشاہ سلامت واپس جانا چاہتے ہیں

(پراکلا نیچے کسی سے گفتگو کرتی ہے)

پراکلا :- میری مالکہ کہتی ہے کہ وہ نیچے نہیں جائے گی۔ کاش میں ایسے خوفناک مینار پر نہ ہوتی۔ اگر تم اوپر آئے نہ دوں گے
تو میں گر پڑوں گی

راہب :- آہ ! میں کیا کروں، تم اوپر آ جاؤ لیکن حیران ہوں کہ تم بیٹھو گی کہاں

پراکلا :- یہ بالکل معمولی بات ہے، میں تمہارے پاؤں پر اس طرح بیٹھ جاؤں گی

(اُس کے پاؤں پر بیٹھ کر اپنا سر جھکالیتی ہے)

راہب :- نامعقول !

پراکلا :- لیکن مجھے تو کسی : کسی طرح توازن قائم رکھنا ہے، پھر کیا کروں ؟

راہب :- (بادشاہ سے) کیا تم مجھے اس مصیبت سے نہیں بچا سکتے ؟

بادشاہ :- میں دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیا کرتا۔ دوسری عورت کو بھی اوپر بلا لوتا کہ ہم چل جائیں

(یوڈوشیا سے) آپ اوپر آجائیں

راہب :- آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں

بادشاہ :- ہم یہاں تمام رات نہیں ٹھہر سکتے۔ علاوہ اس کے چونکہ یہ نیچے نہیں جائے گی اس لئے اسے اوپر آ جانا چاہئے

یوڈوشیا :- (اوپر آتے ہوئے) پراکلا کہاں ہے؟ (اس کو دیکھ کر) ہاں وہ ہے

راہب :- محترمہ! یہ میرا قصور نہیں کہ تمہاری خادمہ عقل سے خالی ہے

پراکلا :- بیگم! میں نے یہ صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے کیا ہے ورنہ مجھے تو مینار سے نیچے گرنے کا اندیشہ تھا

راہب :- (انگڑائی لیکر) میری گزشتہ زندگی میں اس طرح کبھی بے عزتی نہیں کی گئی۔ آہ میں کتنا بدبخت ہوں!

پراکلا :- آپ بگڑتے کیوں ہیں۔ میں ابھی اٹھ جاؤں گی

بادشاہ :- راہب! خدا حافظ! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس دو بدطینت اور نا سمجھ عورتیں چھوڑے جا رہا ہوں

(مسخرائی سے اُترتا ہے اور اپنے الگ کا انتظار کرتا ہے)

یوڈوشیا :- (تیزی سے) پراکلا! راہب کو چھوڑ کر الگ کھڑی ہو جاؤ

(پراکلا اپنی خواہش کے خلاف اٹھ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے)

بادشاہ سلامت! ہم نہ بدطینت ہیں اور نہ نا سمجھ، میری خادمہ ابھی بچہ ہے۔ وہ ابھی درست اور نادرست

میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ میں اس راہب کے لئے بہت دور سے آئی ہوں۔ آپ ہمیں نا سمجھ اور بدطینت

کہہ کر انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ دنیا کی بدنامی اور بے عزتی عورتیں نہیں کرتیں بلکہ ہمیشہ مرد کیا کرتے ہیں

بادشاہ :- معاف فرمائیے، واقعی آپ جیسی خوبصورت عورتیں ہمیشہ عقلمند اور نیک طینت ہوا کرتی ہیں

یوڈوشیا :- (نرمی سے) میں آپ کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتی ہوں

راہب :- ذرا ہوش سے کام لو۔ ایسی نادانیوں کے لئے اس مینار پر جگہ نہیں ہے

بادشاہ :- ہاں یہ درست ہے، اے خاتون! خدا حافظ! معزز راہب! خدا حافظ! شاید کچھ عرصہ کے بعد تم سمجھ جاؤ کہ

اس طرح بیٹھے رہنے سے خلق خدا کی مدد کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ معزز لیکن غیر مفید راہب! خدا تمہاری فکر

راہب :- اور تمہاری بھی اے بد نصیب اور مجھ سے زیادہ غیر مفید بادشاہ

(بادشاہ نیچے اُتر جاتا ہے)

راہب :- کیا تم بہت دور سے آرہی ہو؟

یوڈوشیا :- ہاں بہت دور سے۔ میں بہت دور پہاڑی پر رہتی ہوں۔ میرا نام یوڈوشیا ہے لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں

راہب :- تمہاری شہرت کس بات میں ہے؟

یوڈوشیا:۔ کس بات میں؟ آپ بھی عجیب انسان ہیں۔ میں اپنے حُسن کی وجہ سے مشہور ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں میں خوبصورت نہیں ہوں؟

راہب:۔ یہ مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟

یوڈوشیا:۔ اس لئے پوچھتی ہوں کہ اگر میری غلط فہمی ہو دور ہو جائے۔ اکثر لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ حسین ہو لیکن وہ سب راہب۔ آپ جیسے راہب نہیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بتائیں

راہب:۔ اچھا تو میں کہہ دیتا ہوں کہ تم بہت حسین ہو۔ میں نے بہت عورتیں دیکھی ہیں لیکن تم ایک خاص شش رکھتی ہو جس کا سبب غالباً تمہاری دو شیرگی ہے

یوڈوشیا:۔ میں خوش ہوں کہ آپ مجھے دو شیرہ خیال کرتے ہیں

راہب:۔ میرا مطلب یہ نہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ تم دو شیرہ معلوم ہوتی ہو

یوڈوشیا:۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہے

راہب:۔ تو کیا تم نرم لہجہ میں گفتگو کرنے آئی ہو؟ اچھا تو یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟

یوڈوشیا:۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ مرد عموماً بے وقوف ہوتے ہیں اور اُن میں حیوانیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے اُنکو

خوش کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس لئے میں ایسے لوگوں سے اپنی خوبیاں سکرتنگ آگئی ہوں۔ اب میں

ایسے شخص سے ملنا چاہتی ہوں جو میرے حُسن کا تو قائل ہو لیکن مجھے محبت کرنے سے نفرت کرتا ہو

راہب:۔ یوڈوشیا! تم غلطی پر ہو۔ کیا تم مجھے بھی مسخر کرنا چاہتی ہو۔ لیکن ایک راہب کو مسخر کرنا آسان کام نہیں

یوڈوشیا:۔ معزز راہب! ایسا نہ ہو میں فوراً معلوم کر لیتی ہوں کہ میرے ساتھ گفتگو کرنے والا شخص مجھ سے محبت کرتا ہے

یا نہیں اور جو مجھ سے محبت کرنے لگتا ہے وہ وہی کرتا ہے جو میں کہتی ہوں

راہب:۔ لیکن میں تو ان میں نہیں ہوں

یوڈوشیا:۔ آپ بھی انہی میں سے ایک ہیں

راہب:۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں

یوڈوشیا:۔ (اپنی نگاہیں اُس کی نگاہوں میں ڈال کر) راہب! کہہ دو کہ یہ غلط ہے

راہب:۔ (غصہ سے بھر جاتا ہے) تم بڑی شریر ہو تم میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ یہاں آکر میری بزرگی کو داغدار کرو۔

پراکلا:۔ (ارد گرد نظر دوڑا کر) مجھے تو بھوک لگی ہے

لاہب:۔ وہ کچوروں کی ٹوکری اسے دے دو۔ ہاں، تم میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ یہاں آؤ اور مجھ پر اپنا

جادو چلاؤ

یوڈوشیا:۔ نہیں یہ جادو نہیں ہے۔ یہ میری ایک طاقت ہے جس کے استعمال کرنے میں مجھے بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی۔ راہب! میں تمہیں مجبور کر سکتی ہوں کہ تم میرے ساتھ محبت کرو اور میں اس کا تجربہ کرنا چاہتی ہوں، اچھا، آؤ میرے ساتھ مینار سے نیچے اُترو

راہب:۔ کیا؟

یوڈوشیا:۔ مینار سے نیچے اُترو۔ آؤ میرے ساتھ نیچے چلو
راہب:۔ مینار سے نیچے اُتر دوں؟، ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا
(مسکراتا ہوا اُس کی طرف دیکھتا ہے)

یوڈوشیا:۔ میں نے تم جیسا خوفناک انسان کبھی نہیں دیکھا۔ تم ایک سرور زندگی کو جس میں تمہاری خواہش کے مطابق سب کچھ میرے ہو سکتا ہے اس مینار کی زندگی پر قربان کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی جوش تمہیں اس پر مجبور کرتا ہے، لیکن میں تو اس خیال سے ڈرنے لگتی ہوں

راہب:۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنی زندگی بسر کرو اور میں اپنی
یوڈوشیا:۔ مگر میں اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ میرا راستہ آسان نہیں۔ تاہم مصائب اور تلخ تجربات کے بغیر مسائل زندگی کو حل نہیں کیا جاسکتا

راہب:۔ یوڈوشیا! مجھے تم پر رحم آتا ہے، اگر تم اپنی زندگی میں تھوڑی تبدیلی کر لو تو؟
یوڈوشیا:۔ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کر لوں؟ ہرگز نہیں۔ ایسی زندگی میری سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ میں آخر وقت تک ایسی ہی زندگی بسر کروں گی۔ ہم جارہے ہیں، خدا حافظ معزز راہب!
راہب:۔ خدا حافظ، یوڈوشیا!

(وہ اُس کی طرف دیکھتی ہے اور چلی جاتی ہے)
شام ہو گئی ہے اور چند ستارے بھی آسمان پر نظر آرہے ہیں۔ راہب کتاب کھولتا ہے۔
راہب پڑھتا ہے:۔

”جب ایک عورت تبسم خوشی سے معمور تمہارے سامنے آتی ہے تو کیا تم
(جلد کتاب بند کر دیتا ہے) اندھیرا ہو گیا ہے، اب میں نہیں پڑھ سکتا“

اندھیرا ہو جاتا ہے اور مینار کے گرد ایک گولہ سا نظر آتا ہے۔ اُس میں سے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں۔
راہب سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور گانے کی آواز میں کہتا ہے:۔
”کتنی ہی سخت آندھیاں آئیں لیکن صبر کو کسی روشنی کی ضرورت نہیں جو اُس کا راستہ روشن کرے“

ہر رات مجھے صبر کی تلقین کرتی ہے

جنگ کے دوران میں بہت نقصان ہوتا ہے لیکن کامیابی زیادہ نقصان اٹھانے والے کے پاؤں چومتی ہے۔

(ایک عجیب آواز) راہب! خوش الحانی سے گاؤ

راہب :- میں خوش الحانی سے گارہا ہوں۔ میری روح رات ہی کے وقت بیدار ہوتی ہے

(گاتا ہے) ”خوشی مذہبی یقین بختہ ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور امن قبر کی لمبی کوتاہ کر دے گا“

آواز :- اس سے بھی زیادہ خوش الحانی سے گاؤ

راہب :- جس طرح میں چاہوں گا گاؤں گا

(گاتا ہے) ”جو لوگ اپنے داغ عصیاں کو آنسوؤں سے دھوتے ہیں وہ خوش رہیں گے۔ وہ موت کے دروازہ

پر کھڑے ہیں لیکن خوف محسوس نہیں کرتے“

آواز :- راہب! ٹوٹے ہوئے ساز کی طرح گانا بند کر دو اور اچھی آواز میں گاؤ

راہب :- میں تو نہایت خوش الحانی سے گارہا ہوں

آواز :- خوش الحانی سے؟ (زور سے ہنسی کی آواز مینار کو بلا دیتی ہے) تمہیں اس سے بھی زیادہ خوش الحانی سے

گانا چاہئے

راہب :- کیوں؟

آواز :- آنے والے کا خیر مقدم کرنے کے لئے

راہب :- اب میرے پاس کون آئے گا؟

بہت سی آوازیں :- ابلیس

راہب :- ابلیس؟ کیا یہ شور اسی کی علامت ہے کہ ابلیس آ رہا ہے؟ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ ابلیس پہلے بھی آتا رہا

ہے اب بھی آجائے۔ وہ کہاں ہے؟ آوازیں (آہستہ سے) وہ آ رہا ہے راہب! وہ آ رہا ہے

راہب :- اُسے آنے دو

ابلیس (راہب کے دائیں ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے) راہب! شکریہ، میں آگیا ہوں

(ابلیس اونچا جوان اور خوبصورت معلوم ہو رہا ہے۔ اُس کے سر پر بالوں کی خوبصورت ٹوپی ہے وہ آہستہ

آہستہ احتیاط سے بول رہا ہے۔ لباس کافی چمکدار ہے۔ ایک دوست اُس کے ساتھ ہے۔ وہ سیاہ رنگ

اور غصہ سے بھرا ہوا ہے۔ تینوں کے چہرہ پر زرد روشنی پڑ رہی ہے)

راہب :- میرا سلام قبول فرمائیے

سب کچھ میرے فائدہ سے نہ نظر مجبور ہے کہ تم سے بدلہ لے اور تمہارا غرور و تکبر خاک میں ملا دے

رامپ :- غرور نہیں، یہ سب کچھ عادت کی وجہ سے ہے

ابلیس :- کیا ؟

رامپ :- ہاں، عادت بات میرے مذہبی یقین پر تعجب کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میرا غرور بے فائدہ ہے۔ میں تمہیں بتا دینا

چاہتا ہوں کہ یہ مذہبی یقین نہیں بلکہ عادت ہے۔ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ضرور مینار سے نیچے اترتا میں

پہلے زائر کے ساتھ پہاڑوں کی خوبصورت گھومتی ہوئی سڑکوں پر جاتا۔ میں بادشاہ کی مدد کرتا۔ میں یوڈوشیا۔

آہ! یوڈوشیا کے ساتھ بھی جاتا لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں کہ میں

مینار سے نیچے اتروں۔ میری زیارت کرنے والے لوگ مجھ سے زیادہ نیک ہوتے ہیں۔ ایک طوائف جس کا

مقصد روپیہ کمانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنے شراب پئے ہوئے چاہنے والے کے ساتھ یہاں آتی ہو لیکن

بزرگی میں مجھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے یہ زندگی عالم شباب میں شروع کی تھی۔ اب میں خواہ غلطی پر ہوں یا

صحیح راستہ پر، خواہ اس کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو اس زندگی کو ترک نہیں کر سکتا۔ میں کسی دوسرے ماحول میں زندہ

نہیں رہ سکتا میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہونگا۔ تمہیں یہاں اس وقت آنا چاہئے تھا جب کہ میں نے یہ زندگی شروع کی تھی

ابلیس :- لیکن عالم شباب کے جوش پر قابو حاصل کرنا میری طاقت سے باہر ہے

رامپ :- خیر، اب یہ بالکل بے وقت ہے۔ اب میری عادت ہو گئی ہے اس لئے میری بقیہ زندگی بچی یہیں بسر ہوگی۔

ابلیس :- میں اسے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ عادت تو اتنی سخت نہیں ہوا کرتی

رامپ :- پہلے زائر سے کہہ کر دیکھو کہ اپنا سفر ترک کر دے، بادشاہ سے کہہ کر حکومت چھوڑ دے، یوڈوشیا سے کہو۔

لیکن اس پر عمل نہ کرنا۔ کہ اپنی دلوں پر قابو حاصل کرنے والی طاقت کو ترک کر دے، پھر دیکھو وہ کیا کہتے ہیں

ابلیس :- لوگوں کے خیالات عموماً بابل جاتے ہیں

رامپ :- ایک شخص کی زندگی میں فوراً انقلاب برپا کر دو تم دیکھو گے کہ چند روز میں پھر اسی راستہ پر آجائیں گے۔ اس رات

میرے مینار کو توڑ دو، تم مجھے چند روز میں کسی دوسرے مینار پر دیکھو گے۔ اب تم جاؤ میں تھک گیا ہوں، اور مجھے

گفتگو کی بہت نہیں۔ جاؤ اور میرے مریدوں کو بکلاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتے ہیں لیکن اب یہاں نہ ٹھہرو۔ میں

بہت تھک گیا ہوں۔ (ابلیس چلا جاتا ہے)

رامپ :- آؤ، کس قدر تکلیف دہ دن تھا۔ شکر ہے کہ سب چلے گئے۔ رات کے بعد خاموشی اور خاموشی کے بعد کل راحت

ہوتی ہے۔ اس اندھیری رات میں۔ آہ! یوڈوشیا، تو مجھے بے وقت کیوں ملی۔ اب مجھے سو جانا چاہئے۔

سو جانا چاہئے (آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بڑبڑاتا ہے) میں یہاں ایک نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا۔ (خاموشی)

ریاستوں کی آزادی وفاق کے نقطہ نظر سے

ریاستوں کے متعلق شرکت وفاق کے بارہ میں اس وقت تک جتنی رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر بے اختیار یہ مصرعہ یاد آجاتا ہے کہ :- تو کہے گبر مجھے، گبر مسلمان مجھ کو — درانحالیکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت ریاستوں کے سامنے ”کفر و ایمان“ سے زیادہ من و تو کا جھگڑا درپیش ہے اور ان کو اس کے فیصلہ کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں کے طرز عمل کے متعلق برطانیہ عظمیٰ اور برطانیہ ہند دونوں جگہ سخت غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے ایک طرف تو ریاستوں پر یہ الزام قائم کیا جاتا ہے کہ وہ ”کامل خود مختاری“ کا مطالبہ کر کے حد درجہ خود غرضانہ پالیسی اختیار کرنا چاہتی ہیں اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ شرکت وفاق سے وہ اپنے جائز حقوق ملکیت کو بھی ہاتھ سے دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں الزام بے بنیاد ہیں

پہلے الزام کی لغویت تو اس سے ظاہر ہے کہ ریاستوں کے نقطہ نظر سے ”خود مختاری“ کا تصور ہی بالکل بے معنی چیز ہے۔ کیونکہ جیسا سرنہری مین نے ۱۸۶۴ء کے مقدمہ کاٹھیاوار کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے، ”خود مختاری“ کوئی ایسی چیز نہیں جس کے درجے متعین ہو سکیں۔ ہندوستانی ریاستیں صحیح معنی میں اسی وقت ”خود مختار“ کہلائی جاسکتی ہے جب شہنشاہ ہند سے ان کے تعلقات اطاعت و فرمانبرداری محو ہو جائیں، از روئے معاہدات تاج سے جو رشتہ قائم ہے اسے توڑ دیں اور برطانوی حکومت سے بالکل قطع تعلق کر کے خارجی مداخلت اور اندرونی حفاظت کی تمام پیچیدگیوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لیں۔ پھر جب ریاستیں اس عمل کی اہلیت نہیں رکھتیں اور نہ نظریہ کے لحاظ سے اسے مناسب سمجھا جاسکتا ہو تو پھر یہ کہنا کہ ان کا مطالبہ خود مختاری خود غرضی پر مبنی ہے کیونکہ درست ہو سکتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ضرور ہو سکتا ہے کہ خود مختاری کے ایسے وسیع معنی لینے کی ضرورت نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ریاستوں کی یہ کوشش نہیں ہے کہ وہ حکومت بالادست کی گرفت سے آزاد ہو جائیں اور کیا ان کا یہ مطالبہ خود ان کے پاپورے ملک کے مفاد کے لئے درست ہو سکتا ہے؟ اس الزام کی صحت یا عدم صحت پر حکم لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ حکومت بالادست کی اس عملی سیاست کو سمجھ لیں جو ریاستوں پر صرف کی جاتی ہے

اس میں شک نہیں کہ سرنہری مین کے قول کے مطابق ”خود مختاری“ تقسیم ہونے والی چیز نہیں اور نہ اس کے

ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں، لیکن ریاستہائے ہند اور تاج کے موجودہ تعلقات کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ نہ بکثرت "خود مختاری" ریاستوں اور تاج کے مابین ضرور تقسیم ہو گئی ہے اور قوت بالادست نے ریاستوں کی اس خود مختاری پر جواز دے کر اسناد و معاہدات انھیں حاصل ہونا چاہئے، یقیناً بہت کچھ قبضہ کر لیا ہے

قبل اس سے کہ ہندوستان کے لئے وفاقی طرز حکومت تجویز کی جاتی، ریاستیں ڈر رہی تھیں کہ ان کی کبھی کبھی آزادی بھی کہیں ختم نہ ہو جائے۔ وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ برطانیہ کی سیاسی حکمت عملی بہت سے معاملات میں ان کی آزادی چھین چکی ہے اور جو کچھ باقی رہ گئی ہے وہ بھی اس رحم و کرم پر موقوف ہے۔ پھر ان کا یہ اندیشہ صرف قیاس پر مبنی نہ تھا بلکہ سرکاری طور پر بھی اس کی تصدیق ہو چکی تھی کیونکہ سر رابرٹ بالینڈ نے (جب وہ حکومت ہند کے متحد سیاسی تھے) ایک بار ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں جب حکومت برطانیہ تمام ملک کو سیاسی وحدت میں تبدیل کرنا چاہتی تھی تو حالات جدید کے ماتحت دستوری اصول میں بہت تیز کرنا پڑا، اور اس اصول کی رو سے بعض مسائل میں (مثلاً مسائل حدود و ہندو) تعمیر ریلوے و تار، چھاؤنیوں کا نظم و نسق وغیرہ) ان تعلقات سے تجاوز کرنا پڑا جو مابین تاج اور ریاستہائے ہند قائم تھے اور ریاستوں کی منظوری یا عدم منظوری کا اس باب میں کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ سر بالینڈ نے اس کا اعتراف کیا کہ برطانوی حکومت اور ریاستوں کے تعلق نے (ماوراء معاہدات و اسناد) جو رواجی صورت اختیار کر لی تھی وہ نیت کے لحاظ سے قابل اعتراض نہیں اور نہ اس کا مقصود ورکیسوں کے اختیارات کو کم کرنا ہے گویا ایک حد تک وہ متصرفانہ ضروری ہے۔

الغرض ریاستیں برطانیہ کی اس پالیسی کو بہت مشتبه نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور اچھی طرح جانتی تھیں کہ جن طریقوں سے ان کی آزادی رفتہ رفتہ ختم کی جا رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اب بھی جاری ہیں بلکہ برطانوی ہند کے قومی مطالبات کی وجہ سے زیادہ سخت و وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن رؤساء ہند کی تمام انفرادی و اجتماعی کوششیں آج اور ہاتھوں کے تعلقات کی تعیین نہ کرا سکیں بلکہ اس کے برخلاف جب ہار کورٹ بلر کمیٹی سے اصرار کیا گیا کہ وہ قوت بالادست کے اختیارات کی تعیین کر دے تو قوت بالادست کا منہم اور زیادہ وسیع و پکدار صورت میں پیش کیا گیا اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ حکومت ہند کا محکمہ سیاسیات اپنے اقتدار و اختیار کو ہاتھ سے دینے کے لئے طیارہ تھا

برطانوی قوم، منطق پسند قوم نہیں ہے کہ وہ محض تصورات و قیاسات سے کام لیا کرے وہ ہمیشہ موجودہ مشکلات کو سامنے رکھ کر ان کا فوری علاج سوچتی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جو معاہدات اس قوم نے کئے تھے وہ اسی وقت کے لحاظ سے مناسب تھے اور ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ تمام ریاستیں ایک دوسرے سے جدا کر دی جائیں اور اسکا امکان باقی نہ رہے کہ وہ کسی وقت آپس میں ملکر حکومت برطانیہ کے اقتدار کو کم کر دیں۔ جس زمانہ میں یہ معاہدے ہوئے تھے اس وقت برطانوی ہند میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو موجودہ ترقی یافتہ طرز حکومت سے مشابہ ہوتی۔ لیکن بعد کو جب آہستہ آہستہ نظم و نسق نے مرکزی طرز حکومت کی صورت اختیار کر لی تو برطانوی ہند اور ریاستہائے ہند کی حکومتوں کے درمیان نمایاں فرق

محسوس ہونے لگا۔ یعنی ہندوستانی آبادی کا سچ حصہ اور ہندوستانی رقبہ کا سچ ایک مضبوط مرکزی حکومت سے متعلق ہو گیا اور ملک کا باقی حصہ جو مختلف و متعدد ریاستوں میں علیحدہ علیحدہ منقسم تھا برطانوی ہند کے مقابلہ میں اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اگر ریاستیں مشترک حالت میں نہ ہوتیں اور ایک ہی حصہ زمین میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوتیں تو صورت حال کچھ اور ہوتی، لیکن چونکہ وہ تمام برطانوی ہند میں پھیلی ہوئی ہیں اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ان کو نظر انداز کر کے برطانوی ہند میں مرکزیت پیدا کی جائے۔ حکومت کا یہ رجحان انیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں زیادہ نمایاں ہونے لگا، جبکہ برطانوی ہند کے وسیع مطالبات و ضروریات کے تمام مسائل انتظامی کو ”آل انڈیا“ حیثیت سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ریاستوں کا تعاون حاصل کرنا بھی ضروری تھا خواہ وہ معاہدات کے منافی ہو تا یا ریاستوں کی مرضی کے خلاف۔ اور اگر ایسا نہ کیا جاتا (خواہ وہ جبر و ظلم کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوا ہو) تو ہندوستان کی اقتصادی وحدت جس کا قیام (سڑکوں، ریلوں، تار، ٹیلی فون اور لاسٹکی وغیرہ کی بابت ایک مشترک و متحد طریقہ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے) ضروری ہو گیا تھا، حاصل نہ ہوتی۔ پھر اس میں شک نہیں کہ اس غرض کی تکمیل میں ریاستوں کے معاہداتی موقف کو نقصان پہونچا، لیکن یہ کہنا کہ قوت بالادست نے ہمیشہ اور ہر جگہ ریاستوں کو نقصان پہونچایا درست نہیں۔ اگر ہم گزشتہ تین چوتھائی صدی کے اندر برطانوی ہند کے ان انقلابات کو سامنے رکھیں جو غیر معمولی تیزی کے ساتھ وہاں رونما ہوئے تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ ریاستیں کیونکر اپنی روایتی انفرادیت کو قائم رکھ سکیں اور یہ واقعہ ہے کہ اگر حکومت بالادست ان کی معاون نہ ہوتی تو یہ رہا سہرا اقتدار بھی ریاستوں کا ختم ہو جاتا۔ اس لئے اگر ایک طرف حکومت بالادست پر یہ الزام قائم ہو سکتا ہے کہ اس نے مصالح انتظامی کی وجہ سے ریاستوں کی خود مختاری کو گھٹایا تو دوسری طرف اس کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ ریاستوں کی انفرادیت محض قوت بالادست کی وجہ سے ہنوز قائم ہے

اس میں شک نہیں کہ اندرونی معاہدات برطانوی حکومت کو ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں، لیکن اگر قوت بالادست لفظ بہ لفظ اس پر عمل کرتی تو انیسویں صدی کے دوران میں خدا جانے کتنی ریاستیں نیست و نابود ہو جاتیں۔ وہ برطانوی مدبرین جو ریاستوں میں برطانوی مداخلت کے مخالف تھے، وہی تھے جو ریاستوں کی بقا کو پسند نہ کرتے تھے اور ہر چند مداخلت کی پالیسی معاہدات کی رو سے ناجائز تھی لیکن اگر اس پر عمل نہ کیا جاتا تو بڑی اقتصادی پریشانی، نقص امن اور جانیشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے بہت سی ریاستیں تباہ ہو جاتیں

جیسا کہ ابھی ہم ظاہر کر چکے ہیں، برطانیہ کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ ریاستوں کی انفرادی حیثیت کو فنا نہ ہونے دے اور اسی پالیسی کی عینک سے ہمیشہ معاہدات کو دیکھا گیا۔ فرض کیجئے کہ ایک ریاست میں جانیشینی کے دو امیدوار پیدا ہوتے ہیں اور وہاں کی آبادی کا ایک حصہ ایک امیدوار کا طرفدار ہے اور دوسرا حصہ دوسرے امیدوار کا اگر ایسی صورت میں قوت بالادست مداخلت نہ کرے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہاں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ریاست تباہ

اسی طرح اگر کسی ریاست میں بذلتی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور امن و سکون قائم نہیں رہا ہے تو اس کا بھی لازمی نتیجہ وہی ریاست کی تباہی ہے۔ پھر جبکہ برطانوی حکومت ریاستوں کی بقا کی ذمہ دار ہو چکی ہے اور خود اس کے مصالح کا اقتناء بھی یہی ہے کہ ریاستیں باقی رہیں تو وہ معاہدات کی لفظ بہ لفظ پابندی کر کے کیونکر یہ مقصود حاصل کر سکتی تھی اور اگر ایسی صورتوں میں وہ مداخلت کرتی ہے تو کس کو اعتراض کا حق حاصل ہو سکتا ہے

سیاسیات کے طالب علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ تاج کی طرف سے ہمیشہ معاہدات کا احترام ملحوظ رکھنے پر زور دیا گیا اور لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف معاہدات کے خلاف ریاستوں کے معاملات میں مداخلت بھی کی گئی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہر چند قانونی نقطہ نظر سے قوت بالا دست کو اس مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن برطانوی ہند کے مصالح انتظامی، نیز خود ریاستوں کے بقا و تحفظ کے خیال سے، مداخلت ضروری تھی اور اس طرح ریاستوں پر اس تنازعہ معاہدات کا مسئلہ محض قانونی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے یعنی اگر ایک طرف برطانوی ہند کی سیاسی ضروریات کا خیال رکھنا پڑتا ہے تو دوسری طرف ریاستوں کی انفرادیت کو قائم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور انھیں دونوں میں توازن رکھنا حکومت ہند کی سیاسیات کا وہ کارنامہ ہے جس کی عظمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے

اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ حکومت ہند کی ڈپلومیسی کی تاریخ کیا ہے اور ریاستوں کی آزادی، حکومت بالا دست اور رئیسوں کے درمیان کیوں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ بہر حال اب غور طلب یہ ہے کہ کیا ان حالات کے ماتحت ریاستوں کا اپنے موجودہ پوزیشن میں تبدیلی چاہنا یا وفاق میں شرکت کے لئے گفت و شنید کرنا کسی خود غرضی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ وہ حضرات جو ہندوستان کے سیاسی نظام سے واقف نہیں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ریاستوں کے لئے یہ اچھا موقع ہے کہ وہ گزشتہ ایک صدی کے حالات میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ چنانچہ وہ سوال کرتے ہیں کہ ریاستیں وفاق میں شریک ہو کر (علاوہ ان اختیارات کے جو انہوں نے معاہدات اب سے قبل حکومت برطانیہ کو تفویض کئے جا چکے ہیں) کیوں اور دوسرے معاملات برطانیہ کے سپرد کر دیں۔ وہ وفاق میں شریک ہو کر وفاق میں مسائل میں برطانیہ کی بجا مداخلت کو کیوں قانونی حق میں تبدیل کر دیں اور کیا وفاق کی شرکت سے ریاستوں کو اپنے حقوق کی قربانی اور زیادہ نہ کرنا پڑے گی

اس قسم کے اندیشوں کا سبب ان لوگوں کا محض جذبہ ہمدردی نہیں جو ریاستوں کی خود مختاری کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کا دوسرا سبب یہ خوف بھی ہے کہ مبادا اس طرح حکومت برطانیہ کے سیاسی اثرات ریاستوں پر اور زیادہ قوی ہو جائیں اور یہی سہی آزادی بھی چین جائے۔ حال ہی میں بعض اطراف سے یہ بے بنیاد شکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ جب اس وقت بھی بعض ریاستیں پولٹکل افسران پر بہ نسبت اپنی رعایا کے زیادہ اعتماد کرتی ہیں تو شرکت وفاق کے بعد اس میں اور اضافہ ہو جائیگا اور ان ریاستوں میں بھی یہ وبا پھیل جائے گی جو ابھی تک اس سے محفوظ ہیں اور

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاستوں اور ان کی رعایا کے درمیان اتحاد عمل کی راہ بہت تنگ ہو جائے گی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شرکت وفاق کے بعد اس کا بہت امکان ہے کہ برطانیہ ملک کی قومی پالیسی کو شکست دینے کے لئے ریاستوں کو اپنا آلہ کار بنائے۔ کیونکہ ریاستوں کے بنیاد پر جو انتخاب شدہ نہ ہوں گے نامزد کردہ ہوں گے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھ میں بالکل موم کی ناک ہونگے اور مقصد وفاق میں وہی کہیں گے جو پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کہلوائے گا۔ الغرض ریاستوں کی شرکت وفاق میں صرف یہ معنی رکھتی ہے کہ ملک کی قومی پالیسی کے خلاف برطانوی حکومت کے اقتدار کو ہندوستان میں اور زیادہ قوی بنایا جائے

لیکن حکومت برطانیہ اور ریاستوں کے تعلقات پر جو روشنی اس سے قبل ڈالی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطرات بے بنیاد ہیں کیونکہ ہر چند معاہدات و اسناد کو دیکھتے ہوئے ریاستوں کی موجودہ خود مختاری بہت کم ہو گئی ہے، لیکن موجودہ ڈیپوٹسی کا نظام، معاہدات پر قائم ہی کب ہے، اس کا تعلق تو اس طرز عمل سے ہے جس نے تاریخ کے ساتھ ساتھ رواج کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پھر اگر کوئی شخص جو ریاستوں کی آزادی کامل کا طرفدار ہے محکمہ سیاسیات کے تصرف و دستبرد کا شکی ہے اور اس کو نادرست و ناجائز سمجھتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اگر محکمہ سیاسیات کی یہ پالیسی نہ ہوتی تو آج بہت سی ریاستیں ختم ہو گئی ہوتیں۔ کیونکہ قوت بالادست ہی ایک ایسا عنصر ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ صرف یہ کہ ریاستوں کا بقادشوار ہو جاتا بلکہ خود برطانوی ہند کا نظام حکومت بھی موجودہ صورت اختیار نہ کر سکتا یہ قوت بالادست ہی کے اختیارات تھے، جنہوں نے برطانوی ہند کے قومی مطالبات اور ریاستوں کے انفرادی وجود دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر کر دیا

اب رہا یہ کہنا کہ ریاستوں کو صرف وہی مسائل و فاقی حکومت کے سپرد کرنا چاہئے جو ان کے اسناد و معاہدات اس سے قبل سپرد ہو چکے ہیں، گویا اس بات کا مطالبہ کرنا ہے کہ ہندوستان پیچھے بہت کر اس زمانہ میں پہنچ جائے جب معاہدے کرنے کی رسم جاری تھی

وہ زمانہ وہ تھا جب برطانوی ہند برطانوی ہند نہ تھا، نہ کوئی قومی تحریک ملک میں پائی جاتی تھی اور نہ آل انڈیا تحریکات کا وجہ یہاں نظر آتا تھا اس لئے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاہدات و اسناد کے خلاف ریاستوں کے اختیارات کی کمی نے ہندوستان کی ترقی میں کافی مدد دی اور ہر چند ریاستوں کے لئے یہ قربانی بہت قیمتی ثابت ہوئی اور بعض اوقات صرف یہ کہ نامناسب ذرائع سے حاصل کی گئی بلکہ خود رئیسوں سے بھی استخراج نہیں کیا گیا تاہم یہیں کلام نہیں کہ "موجودہ ہند، کا نشوونما قوت بالادست کی اسی پالیسی کا مرہون منت ہے اور یہ کہ اگر یہ پالیسی اختیار نہ کی جاتی تو ریاستوں کا انفرادی وجود قطعاً باقی نہ رہتا

لیکن اس کا ایک رخ اور بھی ہے، وہ یہ کہ قوت بالادست باوجود اس قدر مفید ہونے کے بسا اوقات واقعی

زیادتی کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ یعنی جب کوئی نزاع ریاستوں اور حکومت کے درمیان پیدا ہوئی تو وہی جج بنی اور اسی نے ریاستوں کے حقوق و مواجب کی تعیین و صراحت کی۔ پھر چونکہ فطرت انسانی کمزوریوں سے خالی نہیں ہے اسلئے بسا اوقات پولٹکل افسران کی طرف سے اختیارات کا غلط استعمال ہوا اور رفتہ رفتہ ان اختیارات کی وسعت کا یہ عالم ہو گیا کہ اب ریاستوں کے ایڈمنسٹریشن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو قوت بالادست کی نگرانی و اقتدار سے باہر ہو۔

لیکن اس کا علاج نہ یہ ہے کہ قوت بالادست کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے نہ یہ کہ اس نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے اسے کالعدم قرار دیا جائے بلکہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قوت بالادست کے متصرفانہ طرز عمل کو دور کیا جائے تاکہ وہ کانٹٹی ٹیوشن یا مخصوص ضابطہ کے اندر رہ کر اپنے اختیارات صرف کرے اور فی الحقیقت یہی وہ خیال تھا جس کے تحت بہت سی ریاستوں نے اُن احکامات اصلاح پر غور کرنا شروع کیا جن کی وفاقی حکومت کے سلسلہ میں توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ ریاستوں ہی کا اصرار و اثر تھا کہ گول میز کانفرنس میں وفاقی مرکزیت پر زور دیا گیا اور یہ اصرار اس لئے کیا گیا کہ نایندگان ریاستہائے ہند کے نزدیک قوت بالادست کے متصرفانہ طرز عمل سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ یہاں ایک ذمہ دار وفاقی مرکزی حکومت قائم کر دی جائے۔

وفاقی امور کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اگر ریاستوں نے انھیں وفاقی حکومت کے سپرد کر دیا تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ قوت بالادست کو ریاستوں میں اور زیادہ مداخلت کا قانونی حق دیدیا، درست نہیں۔ کیونکہ وفاقی امور کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر ایسے ہیں جن پر اب بھی ریاستوں کو چون و چرا کا حق حاصل نہیں۔ بعض تو ایسے ہیں، جو کبھی ریاستوں کے اقتدار میں تھے ہی نہیں اور بعض ایسے ہیں جو عرصہ سے قوت بالادست کے اختیار میں ہیں۔ اس لئے ان امور کو وفاقی حکومت کے سپرد کرنے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ ریاستوں کے اندر اور زیادہ مداخلت کا موقع پیدا کر دیا گیا، بلکہ برخلاف اس کے معنی یہ ہونگے کہ حکومت بالادست کے غیر آئینی وسیع اختیارات سے نکال کر انھیں ایک آئینی طریق حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ اسناد کی رو سے بعض امور میں ریاستوں کے اختیارات ضعیف ہو جائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسناد و معاہدات کو دیکھتا ہی کون ہے اس وقت تک ان کا کیا لحاظ رکھا گیا ہے کہ آئندہ رکھا جائے گا اس لئے قدیم معاہدات کو سامنے رکھ کر آئندہ کا نظام عمل سوچنا مناسب نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ پولٹکل ڈپارٹمنٹ کا عمل کیا رہا ہے اور اُسے اس سے باز رکھنے کی صورت اگر ہو سکتی ہے تو صرف یہ ہے کہ ابتدائی ۴۴ امور جن میں سے اکثر پر اب بھی ریاستوں کا اقتدار نہیں ہے، مناسب تحفظات کے ساتھ وفاقی حکومت کے سپرد کر دئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوت بالادست کا تصرف جو اس وقت غیر محدود صورت اختیار کئے ہوئے ہے محدود ہو جائے گا اور ان امور کے علاوہ جو وفاق کے سپرد کئے گئے ہیں، باقی تمام معاملات میں ریاستیں آزاد ہو جائیں گی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وفاق میں شریک ہونے کے بعد ریاستوں کی توجہ برطانوی ہند کی طرف زیادہ ہو جائے گی اور اپنی رعایا کی طرف سے کم ہو جائے گی، لیکن یہ خیال بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شرکت وفاق کے بعد ریاستوں کے

نظم و نسق میں کچھ الجھنیں پیدا ہو جائیں گی، لیکن ان الجھنوں کے دور کرنے کے لئے انھیں قوت بالادست کا منہ نہ دیکھنا پڑے گا، کیونکہ وفاقی مسائل وفاقی حکومت ہی طے کرے گی اور اس لئے یہ صورت ہو جائے گی کہ جو ریاست انتظام کے لحاظ سے جتنی زیادہ مضبوط ہوگی اتنا ہی اس کا اثر آل انڈیا معاملات پر پڑے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ریاست کی مضبوطی کا انحصار اسی پر ہے کہ رعایا بھی اس کے ساتھ تعاون کرے۔ پھر یہ کہنا کہ شرکت وفاق کے بعد ریاستوں کی توجہ اپنی رعایا کی طرف کم ہو جائے گی، گویا یہ کہنا ہے کہ ریاستیں خود جان بوجھ کر اپنے اس اثر کو کم کریں گی جو رعایا کے تعاون کے بعد ہی انھیں حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک امر اور قابل غور ہے۔ ہر چیز یہ صحیح ہے کہ وفاقی امور میں قوت بالادست مداخلت نہ کرے گی لیکن اور تمام معاملات میں وہ بدستور قائم رہے گی اور اسے قائم رہنا چاہئے۔ شرکت وفاق کے بعد چونکہ ہندوستان کے نظام حکومت میں ریاستوں کو دخل ہو جائے گا اس لئے ان کے بقا و تحفظ کو اس سے ضرور مدد ملے گی، لیکن جب تک ریاستوں کی انفرادی ملوکیت باقی ہے اور وہ برطانوی ہند کے اصولوں کا پوزیشن اختیار نہیں کرتیں، ظاہر ہے کہ شرکت وفاق کے بعد بھی بہت سے معاملات ایسے باقی رہیں گے جن کی وجہ سے قوت بالادست کا تعلق ریاستوں سے ضرور قائم رہے گا۔ وفاقی و خانہ دانی تعلقات کے علاوہ جو تاج اور ریاستوں کے درمیان قائم ہیں، بعض امور ایسے بھی ہیں جن کو ریاستیں اول اول وفاق کے سپرد نہ کریں گی اور اس سلسلہ میں ریاستوں اور صوبہ جاتی حکومتوں کے درمیان ضرور اختلاف ہوگا، پھر اگر قوت بالادست موجود نہ ہو اور وہ ریاستوں کی حفاظت و بقا کی ذمہ دار نہ بنے تو بڑی دشواری ہوگی۔ ہر چیڈ فیڈیل کورٹ کا وجود بھی اس حفاظت کا ضامن ہے، لیکن کوئی جوڈیشل کورٹ کسی حکومت کے طرز عمل کی عنایت نہیں کر سکتا اور اس لئے قوت بالادست کا وجود جو گورنر جنرل اور گورنروں کے ذریعہ سے اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتی ہے بہت ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ شرکت وفاق کے بعد پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ ریاستوں سے صرف یہ کام لے گا کہ قومی تحریکات کو ان سے دبا دے درست نہیں۔ کیونکہ دارالعوام میں اس کا اعلان ہو چکا ہے کہ ریاستیں اپنے انتظامی امور میں بالکل آزاد ہیں اور نظم و نسق کی تبدیلی میں قوت بالادست کے استخراج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوت بالادست کا اثر شرکت وفاق کے بعد کم ہو جائے گا اور پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کبھی انھیں مجبور نہ کر سکے گا کہ وہ قومی تحریکات کے خلاف کوئی رائے دیں۔ اب رہا یہ اندیشہ کہ ریاستوں کے نمائندے پولٹیکل محکمہ کا اثر قبول کریں گے، سو اس کے ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں جبکہ خود ان نمائندوں کی نیک نامی بھی اسی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ریاستوں کی پوزیشن کو قائم رکھیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرکزی وفاق کے نظام میں کوئی نقص نہیں ہے لیکن وہ نقائص کیا ہیں اور ان کے دور کرنے کی کیا ضرورت ہے اس کا صحیح علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم وفاق پر عمل کریں۔ کیا اصولوں کے نظام میں نقائص نہیں بتائے جاتے تھے، لیکن جب اس پر عمل کیا گیا تو بہت سے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کے متعلق یہ شبہات عمل کے بعد دور ہو جائیں۔ بہر حال جب تک وفاق قائم نہ ہو اس کے حسن و قبح کے متعلق حکم لگانا قبل از وقت ہے اور چونکہ قیام وفاق کے لئے ریاستوں کی شرکت ضروری ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اگر انھوں نے شرکت سے استرازا کیا تو کبھی ہم کو یہ معلوم کرنے کا موقع نہ ملے گا کہ وفاق کے نظام میں کیا نقائص ہیں اور وہ کیونکر دور کئے جاسکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ شرکت وفاق کے بعد صوبہ جاتی حکومتوں کا اثر ریاستوں کی رعایا پر ضرور ہوگا لیکن کیا ریاستوں کے نظام حکومت کا اثر صوبہ جاتی حکومتوں پر نہ ہوگا۔ یقیناً ہوگا اور اتحاد عمل کی یہی وہ صورت ہے جو جدید ہندوستان کی تعمیر میں مدد دی گی۔

ابوالکمال امتیاد میٹھوی

اسوقت لکھنؤ کی محافل شعرو سخن کی رونق دو عناصر پر منقسم ہے۔ اسوقت کا ذکر نہیں جب گرمی محفل کے لئے شمع محفل بھی موجود تھی بلکہ ذکر اس وقت کا ہے جب لکھنؤ میں ”جان سخن“ تو کوئی نہیں لیکن ”اتم گساران سخن“ بہت ہیں۔ مدعا یہ کہ میں اس عہد کی باتیں نہیں کر رہا جب شعرا خود پیدا ہوتا تھا، بلکہ اس زمانہ کی باتیں کر رہا ہوں، جب شعرو شاعری کا تعلق نہ داخلی محرکات سے ہے نہ خارجی موثرات سے، بلکہ صرف اس بات سے کہ ”شعر کہیں تو کیا کریں“ یا یہ کہ ”ہم شعر کہتے ہیں اس لئے کہ کہہ سکتے ہیں“۔ ہاں تو اس دور کی لکھنؤی شاعری کے اجزاء ترکیبی دو ہیں (حیدر آبادی زبان میں) ایک ملکی دوسرا غیر ملکی اور یہ کہنا غالباً غلط ہوگا کہ اس پیوند نے لکھنؤ کی موجودہ شاعری کو بہت فائدہ پہنچایا

اس وقت میں اس بحث میں پڑنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ خالص لکھنؤی شاعری کیا تھی اس کا عروج کب ہوا اور اسکے انحطاط کے اسباب کیا تھے، لیکن یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اسوقت کی لکھنؤی شاعری یقیناً وہ شاعری نہیں، جو اب سے نصف صدی قبل پائی جاتی تھی اور جس میں شایان اودھ کی رنگ رلیوں کے کچھ مٹے مٹے نشانات ڈھونڈنے سے بچاتے تھے اس میں شک نہیں کہ ”لکھنؤ“ کی ”لکھنویت“ (خواہ اس میں شعریت رہی ہو یا نہ رہی ہو) اب بالکل مٹ گئی ہے، لیکن اس کی شاعرانہ مرکزیت بدستور قائم ہے اور شایان اودھ کے زمانہ سے جو سلسلہ ہاہر کے لوگوں کی آمد و رفت کا قائم ہو گیا تھا وہ برابر جاری ہے یہاں تک کہ لکھنؤ کی ذہنی و دماغی ترقی کا کوئی درمیانی دور ایسا نہیں جس کی تاریخ ان ”غیر ملیکوں کا ذکر کئے بغیر لکھی جاسکے

چنانچہ دور متاخر کے ان لوگوں میں جو باہر سے یہاں آئے اور جنہوں نے یہاں کی محافل شعرو سخن میں نمایاں حصہ لیا جناب امتیاد میٹھوی بھی ہیں۔ آپ اٹھٹی ضلع سلطان پور کے رہنے والے ہیں جو اودھ ہی کا ایک حصہ ہے۔ آپ سہ فروری ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نسباً سید ہیں۔ سید محمد علی نام ہے اور امتیاد تخلص۔ آپ کے مورث اسے حافظ سید رسول صاحب غزنی سے ہندوستان آئے اور رئیس پرتاب گڑھ کے ارادتمندانہ اخلاص سے مجبور ہو کر یہیں مقیم ہو گئے۔ یوں تو آپ کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی کی امیٹھی میں ہوئی، لیکن اسکی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ جب آپ ۱۸۹۶ء میں یہاں پہنچے۔ اسوقت یہاں اردو شاعری میں جلال کا طوطی بول رہا تھا اور فارسی میں خواجہ عزیز الدین کی دھاک بٹھی ہوئی تھی

ساتھ ہی ساتھ منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ نے نثر میں ہنگامہ ادب برپا کر رکھا تھا۔ چونکہ امید صاحب کو فطرتاً فارسی سے لگاؤ تھا اس لئے آپ نے ملا علی محمد شیرازی سے جو میاں برج سے لکھنؤ آگئے تھے، اپنے اس ذوق کو پورا کیا، اور خواجہ عزیز الدین ہی کو اپنا فارسی کلام دکھاتے رہے۔ کچھ دنوں بعد آپ کو شاعروں میں شرکت کا شوق پیدا ہوا اور اس طرح اردو شاعری کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہاں کے اساتذہ سخن جلال کو بڑی شہرت حاصل تھی اور اس میں شک نہیں کہ نہ صرف دور متاخرین بلکہ لکھنؤ کے تمام اردو شعراء میں جلال کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔ صحت لغت و زبان کے لحاظ سے وہ سند سمجھے جاتے تھے اور فن کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بڑا تھا۔ چنانچہ امید صاحب نے بھی ان کے یہاں آمد و رفت شروع کی اور اپنا اردو کلام دکھانے لگے۔ لیکن چونکہ جلال صاف و سلیس زبان کے شاعر تھے اور امید صاحب اپنے ذوق کی بنا پر زیادہ تر فارسی ترکیبیں استعمال کرتے تھے اس لئے یہ اُستادی شاگردی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور آخر کار یہ اپنا فارسی و اردو کلام ایک محمد حنیف صاحب رعب کو دکھانے لگے جو شاہ آباد (پنجاب) کے رہنے والے تھے اور ۱۹۱۹ء میں (شاید تکمیل طب کی غرض سے) لکھنؤ آئے تھے۔ امید صاحب جناب رعب کے راج ہیں، لیکن جس حد تک شاعری کا تعلق ہے میں نے ان کے کلیات میں (جو غالباً امید صاحب ہی کی کوشش سے چھپ چکا ہے) میں نے کوئی بات ایسی نہیں پائی جسے دور کا لگاؤ بھی شاعری سے ہو

امید صاحب اکثر غریب خانہ پر تشریف لاتے رہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ فارسی کا ذوق نہایت پاکیزہ رکھتے ہیں۔ مطالعہ نہایت وسیع ہے اور اساتذہ قدیم کے اشعار بہ کثرت مستحضر ہیں (جسے اشعار پریشاں کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اور جو ابھی تک شائع نہیں ہوا)

آپ کا مجموعہ کلام تمام اصناف سخن پر حاوی ہے، اور ہر رنگ میں آپ کی اُس وقت پسندانہ کاوش کا پتہ چلتا ہے جو فارسی ذوق کی وجہ سے آپ کی فطرت ثانیہ ہو گئی ہے اور جس کا پورا لطف آپ کے قصاید میں ملتا ہے۔ آپ کی شاعری میں فارسی ہو یا اردو، انداز بیان کا تنوع زیادہ تر استعمال تراکیب کا ممنون ہے اور اس لئے وہی لوگ اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں، جو فارسی انشا کا ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن خالص جذباتی رنگ بھی آپ کے یہاں پایا جاتا ہے اور کافی تیز۔

فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

دلِ خوں گشت و جانم برب آمد لیک اندوہت	نمیدانم کنوں دیگر چہ خواہد از دل و جانم
لے بنجراں از خبیر یار چہ گویم	زین پیش خبر نیست کہ از دے خبر ہست
ہر دیدہ و دل بر رخ تو و انتواں کرد	مفت ست تماشا و تماشا انتواں کرد
کام جان عاشقانست گم چہ وصلِ دلبراں	لیکن اندر عاشقی ناکام بودن ہم خوش ست
ناہد مناز بر اثر و زشش سجود	این شیوہ ہم بطرز و گردا شستیم

ان اشعار سے جو "ایرانیت" طپک رہی ہے اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے

اُردو میں بھی آپ کا نظام کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور زبان و فن کی غلطیوں سے بچنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

سجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا	بٹہ پر اپنے آپ ہی رو یا کریں گے ہم
کل تک تو ان کے وعدہ فردا کا غدر بھتا	اب آج کیا اجل سے بہانا کریں گے ہم
تو یہ کہتا ہے عبادت گر نہیں تو کچھ نہیں	میں یہ کہتا ہوں، محبت گر نہیں تو کچھ نہیں
مختصر یہ ہے کہ اب تیرے سوا	مجھ کو ہر اک بات سے انکار ہے
چار دن کی تھی زندگی لیکن	یہ بھی ان کی خوشی نہیں، نہ سہی
کچھ نہیں اس کے سوا جلوہ گہ یار کا راز	کوئی حیران کوسے اور کوئی حیراں ہو جائے
جیسے مرسہ پہلو میں کوئی ماہ جہیں ہے	وہ خواب میں دیکھا ہے جو قسمتیں نہیں ہو
کہنے کے لئے مختصر سیحا کی بھی سسین ہو	لیکن غم ہستی کی دوا اور ہی کچھ ہے

یہ اس رنگ کے اشعار تھے، جو مجھے پسند ہیں۔ لیکن اسید صاحب کا فطری میلان جس کی مثالیں ان کے دیوان میں بہت ملتی ہیں، کچھ اور ہے، اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

برق حاصل سوز کا شکوہ، نہ گلچیں کا گم	جلوہ گل خود بہار آشوب گلشن ہو گیا
بچے ہوتا اگر ذوق تو اسے تلخ پیاسی	میں آپ اپنے شکستہ شیشہ دل کی صدا ہوتا
بھلا وارفتہ رفتہ پھر دیا تاب تماشائے	ذرا پھر عشوہ فرما اس نگاہ یار ہو جانا
ہنستا ہوں اپنے خندہ زخم جگر پر آپ	اب پاس خلیج ویدہ گریاں نہیں رہا
وہی کجخت دل پھر دلفریب آگہی نکلا	جسے تو نے اٹھا کر رکھ دیا تھا طاق نیلا
ابھی تک لے ہنول میں گفروش داغ و تر ہوں	ابھی تک آستیں ہے دیدہ خوتا بہ افشاں پر
غیر کا سہرا اور ترا خنجر کہاں	اعتبار دیدہ جو ہر کہاں
گلشن برنگ خواہش افسردگی کہاں	صحرابہ قدر و مست دیوانگی نہیں
نہیں جب اعتبار ان کو مرے افسانہ غم کا	یہ قصہ امتیاز آراے ظن راز داں کیوں ہو
جسے بیتاب کر دے اک نگاہ ناز کی بجلی	وہ دل رہن فریب مشق صبر را نگاں کیوں ہو
جسے اسے جیب و داماں ذوق عریانی میسر ہو	وہ کیوں منت کش دست جنون فتنہ پرور ہو

امید صاحب اس میں تنگ نہیں فارسی ترکیبیں بہت صحیح و شستہ استعمال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ "توالی اضافات"

بھی ان کے کلام میں دل و دماغ پر بار نہیں ہوتی
 امید صاحب کے قصاید بہت شاندار ہیں کیونکہ اس میدان میں ان کے ذوق و وقت پسندی کو پوری طرح پھیلنے کا
 موقع ملتا ہے۔ نثر میں ان کا رجحان زیادہ تر نچا نہ رنگ کی طرف ہے اسی لئے اپنے عنفوان شباب میں جو مضامین وہ
 ادھر پینچ میں لکھتے تھے ان پر بے اوقات نشی سجاد حسین کے مضامین کا دھوکا ہو جاتا تھا
 امید صاحب باوصف اس کے کہ اس وقت ان کی عمر ۶۰ سال کی ہے، نہ صرف صحیح و توانا ہیں بلکہ اپنی خوشدلی اور
 خوش طبیعتی کے لحاظ سے ابھی تک جوان معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چند حال ہی میں ان کو اپنے ایک جوان اکلوتے بیٹے کی موت
 کا سخت صدمہ پہنچا ہے اور اس کی چھوڑی ہوئی اولاد کی وجہ سے ان کی معاشی الجھنیں بہت بڑھ گئی ہیں، لیکن انکی
 غیرت و خودداری اور صبر و شکر کا وہی عالم ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ بات بات پر نہیں پڑنے
 والے انسان کا دل کتنا دانداز ہے

وضع داری اور اخلاق کے لحاظ سے وہ یقیناً اس دور کے انسان نہیں ہیں اور اسی لئے جب کبھی وہ مجھ سے آکر
 ملتے ہیں تو میری نگاہوں کے سامنے خلوص و محبت کا وہ دور آ جاتا ہے، جس کی یادگار اس وقت تو خال خال کہیں نظر آ جاتی
 ہے لیکن کچھ زمانہ کے بعد چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نہ ملے گی

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھوڑ
 نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

دہلی مرحوم کی داستان الم

دلی کا سنبھالا

از خواجہ محمد شفیع دہلوی

مرحوم دہلی کے عروج کے آخری ایام کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جو اب نابود ہے اندازہ بیان
 ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ ————— قیمت ۵۰

مکتبہ جامعہ ————— دہلی - نئی دہلی - لاہور

باب الاستفسار

بہزاد

(جناب سید طفیل احمد صاحب - رائے چور)

ایران کے مشہور نقاش بہزاد کے حالات اگر دستیاب ہو سکیں تو براہ کرم مطلع فرمائیے، نیز یہ کہ کن کن کتابوں سے اس کے مفصل واقعات زندگی معلوم ہو سکتے ہیں

(نگار) بہزاد کی صحیح تاریخ ولادت تو معلوم نہیں لیکن مورخین کا خیال ہے کہ وہ غالباً پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا (یعنی ۱۴۵۰ء کے قریب) اور یہ خیال انھوں نے اس لئے قائم کیا ہے کہ اسکے جو ابتدائی نقوش دستیاب ہوئے ہیں ان پر ۱۴۵۹ء درج ہے۔ گویا ان کے نزدیک تقریباً ۲۰ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہوا ہوگا کہ اس طرح کی نقاشی پیش کر سکے۔ مگر یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے اس سے کم عمر میں اتنی مشق حاصل کر لی ہو یا اور زیادہ محنت ہونے کے بعد اس مرتبہ پر پہنچا ہو

ایرانی مورخین نے اسے ہرات کے مشہور نقاش امیر روح اللہ کا شاگرد بتایا ہے اور ایک ترکی مورخ نے پیر سید احمد تبریزی کا تذکرہ جہانگیری میں، جہانگیر نے لکھا ہے کہ وہ "خلیل مرزا" کی نقاشی کا قبیح تھا۔ بہزاد کا سب سے پہلا سرپرست میر علی شیر نوائی تھا، اسی کے ذریعہ سے وہ حسین بقرہ والی ہرات کے دربار میں پہنچا جہاں اس وقت نوائی، جامی اور خوند میر وغیرہ صاحبان فضل و کمال موجود تھے۔ جب اس خاندان کو محمد خاں شیبانی نے معزول کر دیا تو بہزاد، ہرات سے تبریز چلا آیا جو صفوی خاندان کا پایہ تخت تھا، شاہ اسماعیل صفوی نے اس کی بڑی قدر کی اور شاہی کتاب خانہ کا افسر بنائے تمام کاتب و نقاش اس کی ماتحتی میں کر دیے۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ میں بھی اس کی بڑی عزت تھی۔ سلطان محمد اور آقا میرک دو نقاش اور اس کے ساتھ دربار سے وابستہ تھے۔ بہزاد نے ۹۴۲ھ یا ۱۵۳۰ء میں انتقال کیا اور شیخ کمال خجندی (مشہور شاعر) کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دوسری روایت کے مطابق اس کا انتقال ۹۴۳ھ میں ہوا۔ ہر چند اسکے زمانہ کی تاریخوں سے اس کی نقاشی پر تفصیلی روشنی نہیں پڑتی، لیکن یہ سب نے لکھا ہے کہ وہ بہت بڑا صاحب فن تھا۔ خوند میر نے لکھا ہے

کہ شبیہ کو اصل سے قریب تر بنانے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ حیدر مرزا لکھتا ہے کہ وہ استاد آقامیرک سے کم نہ تھا اور دونوں میں یہ فرق تھا کہ آقامیرک کے نقش میں خجکی زیادہ ہوتی تھی اور بہزاد کے نقوش میں نزاکت۔ شاہ مظفر بھی اس زمانہ کا بہت بڑا نقاش تھا لیکن حیدر مرزا کا بیان ہے کہ بہزاد موقلم کے استعمال اور خطوط کے توازن میں اس سے بہتر تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ بہزاد بہت نازک نقاشی کرتا تھا، خصوصیت کے ساتھ دائرہ صی رکھنے والا چہرہ خوب بناتا تھا۔ بابر کے جانشینوں نے بھی بہزاد کے نقوش کی بڑی قدر کی اور بڑی بڑی قیمتیں ادا کر کے ان کو جمع کیا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ بہزاد لڑائی کے مناظر دکھانے میں کمال رکھتا تھا۔ اہل مغرب نے ایران کے قدیم نقوش فراہم کر کے بہزاد کے نقوش کی تعین میں بڑی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں ایسا خیال ہے کہ وہ تیموری طرز کا نقاش تھا اور خود اس نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی تاہم چھوٹی چھوٹی تصاویر بتانے میں اس کو کمال حاصل تھا، اسی لئے وہ کتابوں کو مصور کرنے میں بہت کامیاب ہوا

انقلاب فرانس

(جناب مرزا محمد اسماعیل صاحب - سارن)

انقلاب فرانس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ صرف دو صفحات میں اس کو بیان کر دیجئے تو آپ کیا کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو داں طبقہ کے لئے سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے تمام اہم تاریخی واقعات اور علمی مسائل نہایت مختصر الفاظ میں ان کے سادہ بیان کیے جائیں اور اس طرح کا ایک سلسلہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ کسی فن میں اختصاصی درجہ کو بنا ہر شخص کا کام نہیں، اس لئے ہر ایک کی عام معلومات بڑھانے کے لئے ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہر جو ایک طرح سے مفصل انداز کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کیا آپ اس طرف توجہ فرمائیں گے

(نگار) آپ کا خیال بالکل درست ہے اور یقیناً یہ ایک کو ایسی ہی تصانیف کی ضرورت ہے، چنانچہ نگار میں استفسار وجوہاً ایک سلسلہ اسی خیال سے جاری کیا گیا ہے۔ اس وقت تک تین جلدیں اس مجموعہ کی شائع ہو چکی ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ اس میں سیکڑوں تاریخی، علمی، ادبی و سیاسی مسائل کو نہایت مختصر الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ "انقلاب فرانس" کی مختصر تاریخ نہایت مختصر عبارت میں درج ذیل ہے:- "انقلاب فرانس" نام اس تحریک کا ہے جو ۱۷۸۹ء میں فرانس کے اندر رونما ہوئی اور سارے یورپ میں پھیل ڈال گئی۔ اس زمانہ میں فرانسیسی آبادی خصوصیت کے ساتھ دیہی آبادی بہت تباہ حال تھی اور حکومت کو مالیاتی پرواہ نہ تھی۔ بادشاہ اور اس کے امراء جو چاہتے تھے کرتے تھے اور مالی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ سارا ملک قحط زدہ سا ہو رہا تھا اتفاق سے اسی زمانہ میں وہاں وائٹرز، روسو وغیرہ چند نفوس ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے لوگوں میں ذہنی انقلاب پیدا

کرنا شروع کیا۔ مثلاً ڈالپٹرنے مذہبی پابندیوں اور رسم و رواج کی جکڑ بندی کے خلاف کہنا شروع کیا اور روسوں نے حکومت کے خلاف نکتہ چینی کر کے لوگوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا کہ جب کسی قوم کی حالت انتہائی بہت ہو جاتی ہے تو اس میں رد و عمل کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور اس وقت اگر کوئی شخص اس آگ کو بھڑکانے والا پیدا ہو جاتا ہے تو وہ لیڈر و رہنما یا نبی و پیغمبر کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ الغرض فرانس کی آبادی یوں نہیں پہلے سے آمادہ بغاوت تھی کہ ڈالپٹر اور روسوں نے اس میں اور قوت پیدا کر دی۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ (اسسٹنٹس جنرل) یعنی پہاگ کی وہ نایندہ جماعت جو شاہ فرانس کے مشورہ کے لئے قائم تھی اور جس کا کوئی اجلاس ۱۷۹۱ء سے اس وقت تک نہ ہوا تھا، طلب کی گئی اور ایک قومی اسمبلی قائم کی گئی، لیکن جو ہیجان لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا وہ یوں آسانی سے فرو نہ ہو سکتا تھا اس لئے ۱۴ جولائی ۱۷۹۱ء کو انھوں نے سب سے پہلے (Bastille) کو جاکر تباہ کیا۔ یہ ایک قید خانہ تھا جس میں ہر وہ شخص نظر بند کر دیا جاتا تھا جس سے بادشاہ ناخوش ہو۔ اسی کے ساتھ ملک کے اور اطراف میں بھی بد امنی پھیل گئی اور انقلابیوں نے اپنا سہ رنگی جھنڈا بڑا کر جمہوریت کا مطالبہ شروع کیا۔ قومی اسمبلی نے یہ رنگ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ امراء کو جو حقوق حاصل ہیں وہ ضبط کر لئے جائیں اور جدید کانٹینیٹیشن مرتب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ہنگامہ کو دیکھ کر بہت سے امراء بھاگ کر انگلستان چلے گئے اور بادشاہ کی حیثیت قیدی سے زیادہ نہ تھی تاہم شاہ پرست جماعت ابھی بالکل ختم نہ ہوئی تھی۔ اس کے دو سال بعد جون ۱۷۹۱ء میں بادشاہ (لوئی شانزدہم) پیرس سے بھاگ گیا لیکن وائس سے پھر واپس لایا گیا۔ اب اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ یہاں (Constitutional Monarchy) قائم کی جائے (اس سے مراد وہ طرز حکومت ہے جس میں بادشاہ کسی آئین کا پابند بنادیا جائے) لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا چونکہ اب یہ آگ زیادہ پھیل گئی تھی اس لئے ملحقہ حکومتوں کو بھی تشویش پیدا ہوئی اور جو فرانسیسی امراء بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے انھوں نے بھی دوسری سلطنتوں کو ابھارا خصوصیت کے ساتھ شاہ آسٹریا نے بہت گہری دلچسپی لی کیونکہ وہ لوئی شانزدہم کا سالہ تھا۔ اس نے فرانس سے مطالبہ کیا کہ وہ بادشاہ کو پھر تخت نشین کرے۔ ادھر فرانس میں جمہوریت پسندوں کی قوت بڑھتی جا رہی تھی اس لئے غیر ملکوں کی مداخلت نے اور زیادہ ہیجان پیدا کر دیا، یہاں تک کہ ۱۷۹۲ء میں آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اب شاہ پروشیا بھی آسٹریا کے ساتھ لگیا، لیکن نتیجہ فرانس کی کامیابی کی صورت میں نکلا، اسکے بعد ایک قومی مجلس یہاں قائم ہو گئی اور جس نے بعد کو جمہوریت کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو لوئی قتل کر دیا گیا اور فرانس آدمی مقید کر دئے گئے۔ اسکے بعد ۱۷۹۳ء میں ایک کمیٹی "حفاظت عامہ" کی غرض سے قائم ہوئی جس کا نام (Committee of Public Safety) تھا اور وہ ہنگامہ دار و گیر شروع ہوا جسے "Reign of Terror" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں امراء اور سیاسی رہنما قتل کئے گئے یہاں تک کہ کوئی کی بیوی میری انسانی نہ بھی ۶ اکتوبر ۱۷۹۳ء کو قتل کر دی گئی۔ یہ ہنگامہ تقریباً دو سال تک قائم رہا۔ اسکے بعد یہاں اکتوبر ۱۷۹۵ء میں (Director) کر دی گئی (اس سے مراد پانچ آدمیوں کی کمیٹی تھی جو حکومت کے نظم و نسق کا پورا اختیار رکھتی تھی) اس ڈائریکٹری کے زمانہ میں پولین کو عروج حاصل ہوا جس نے آخر کار ۹ نومبر ۱۷۹۹ء کو ڈائریکٹری کو بھی ختم کر دیا اور کانسٹیبل کا لقب اختیار کر کے خود فرانس کا حکمران بن گیا۔

مطبوعات موصولہ

فرہنگ عامرہ | چھوٹے سائز کا لغت ہے جس میں عربی فارسی اور ترکی کے تقریباً ۴۰ ہزار الفاظ، صحیح تلفظ کے ساتھ یکجا کر دئے گئے ہیں اور جن کا عام فہم ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ اس فرہنگ کی خصوصیات فاضل مولف نے یہ ظاہر کی ہیں کہ :-

- (۱) الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے اس طرح رکھی گئی ہے کہ کسی لفظ کی جستجو میں دقت نہیں ہوتی
- (۲) صحت تلفظ کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ کے آگے اس کے ٹکڑے کر دئے گئے ہیں اور ہر ٹکڑے پر اعراب دیدئے گئے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو انگریزی زبان کے لغات میں رائج ہے
- (۳) فارسی کی خلافت قیاس اور عربی کی مستعمل جمع اپنے صیغہ مفرد کے ذیل درج کر دی گئی ہے اور کثیر الاستعمال صیغہ ہائے جمع کو مستقل لغت کی حیثیت سے اس کی جگہ پر پھر دوبارہ دیدیا گیا ہے
- (۴) کثیر الاستعمال فارسی مصادر کے مضارعات اور سماعی و قیاسی مشتقات بھی دیدئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ قلیل الاستعمال مصادر کی بڑی تعداد بھی شامل کر دی گئی ہے
- (۵) فارسی میں اکثر حروف دوسرے حروف سے بدل دئے جاتے ہیں، اس کی صراحت بھی ہر حرف کی تقطیع کی ابتدا میں کر دی گئی ہے

(۶) دورِ حاضر کے بہت سے مفید معربات و مفردات اس میں شامل ہیں

(۷) اشیاء کی ماہیت و معانی بیان کرنے میں جدید تحقیقات کا خیال رکھا گیا ہے

(۸) اسماء الرجال کے سلسلہ میں افسانوی افراد اور تاریخی شخصیتوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی گئی ہے

میں نے اس فرہنگ کو بغور دیکھا ہے اور میں نے یہ تمام خصوصیات اس میں پائی ہیں۔ ہماری زبان میں لغت کی کتابوں کی بہت کمی ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ جو جامع بھی ہوں اور مختصر بھی۔ اس لئے ملک کو جناب محمد عبداللہ خاں بٹوئی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے ساہا سال کی محنت کے بعد یہ قابل قدر فرہنگ مرتب کی اور اچھے کاغذ پر مجلد شائع کر کے طلبہ کی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ یہ کتاب مولف سے ”فیروز منزل خورجہ“ کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے

کلیات ہے سید جلال الدین توفیق حیدر آبادی کا جسے ان کے فرزند جناب سید امیر الدین توفیق نے نہایت حسن اہتمام کے ساتھ مجلد شائع کیا ہے

توفیق مرحوم حیدر آباد کے نہایت خوشگوشاعر تھے اور اپنی بختگی کلام کی وجہ سے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ توفیق ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم نہایت اچھی ہوئی اور تربیت اس سے زیادہ اچھی۔ آپ ہر چند قلیل المعاش تھے لیکن یہ دنیاوی تنگیاں آپ کی روحانی ترقیوں میں کبھی حارج نہیں ہوئیں اور آپ نے اپنی ساری عمر ایک بلند اخلاق والے انسان کی طرح بسر کی

اس مجموعہ میں غزلیں، رباعیاں، قطعے، قصیدے، مرثیے اور ثنویاں وغیرہ تمام اصناف سخن پائے جاتے ہیں اور بقدر مشترک جو خصوصیت ان کے ہر رنگ سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ آپ لکھے پڑھے شاعر تھے۔ کلام سے نہ صرف بختگی بلکہ دقت نظر اور کاوش فکر بھی نمایاں ہے، چنانچہ بہت سے اشعار آپ نے مرزا نوشہ کے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ زبان کی صحت اور انداز بیان کی سلاست کا بھی آپ کو بہت خیال تھا، ہر چند آپ جذباتی شاعر نہ تھے، اور رعایت لفظی و صنعت جو اس زمانہ کی خصوصیت تھی بہ کثرت آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے، لیکن بدلیقگی کے ساتھ نہیں۔ اس کلیات کی قیمت تین روپیہ ہے اور دکن بک اینڈ اسٹیشنری مارٹ عابد بلڈنگ حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے

جناب پنڈت کشن پرشاد کول نے ہندوستان کے نئے دستور حکومت کا خلاصہ ہندوستان کا نیا دور حکومت اس کتاب میں پیش کیا ہے اور ہندوستانی اکاڈمی، آلہ آباد نے اسے شائع کیا ہے پہلے دیباچہ میں یہ بتایا ہے کہ آئینی اصلاحات کا آغاز کیونکر ہوا اور اس کے بعد اصلاحات کے درمیانی منزلوں کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ منزل تک کے واقعات کو مختصر و جامع الفاظ میں بیان کر دیا ہے

دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں صورتوں کی خود مختار حکومت پر روشنی ڈالی ہو اور کونسلوں کی ساخت، ایوان اعلیٰ و ادنیٰ کے اختیارات اور مقننہ و عالمہ کے اصول کار سے بحث کی ہے دوسرے باب میں مرکزی حکومت یا بالفاظ دیگر وفاقی حکومت کی تشکیل پر نظر ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنانس وفاقی عدالت اور رزرو بینک کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس کتاب میں دستور جدید پر کوئی انتقادی نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ دستور جدید کی قانونی حیثیت کو بلا کم و کاست پیش کر دیا گیا ہے

جدید ایکٹ اس وقت کی انجیل ہے۔ ہندوستان کے ہر باشندہ کا فرض ہے کہ وہ اسے سمجھے اور دیکھے کہ اس قانون میں کیا ہے اور کیا نہیں۔ پنڈت جی نے اس پیچیدہ آئین کو بہت صاف و سلیس اردو میں پیش کیا ہے اور ملک کو ان کا ممنول ہونا چاہیے

اصطلاحات کا ترجمہ کہیں کہیں تو کیا گیا ہے لیکن اکثر جگہ چھوڑ دیا گیا ہے اور انگریزی کا اصل لفظ رکھ دیا ہے

اس صورت میں زیادہ مناسب یہ تھا کہ ان اصطلاحات کا مفہوم فٹ نوٹ کے ذریعہ سے علیحدہ بتا دیا جاتا۔ بہر حال کتاب مفید و پر محل ہے اور ہر اردو واد کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔

۲۴ صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں مولانا سید علی نقی صاحب نے خود حسین کی زبان سے حسین کا پیغام | ظاہر کیا ہے کہ حسین کس شخصیت کے انسان تھے اور ان پر پہلے درپہ کیا مصائب نازل ہوئے، ساتھ ہی ساتھ یزدی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے واقعہ کربلا پر اس پیام کو ختم کر دیا ہے۔ یہ رسالہ امامیہ مشن لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ قیمت ایک آنہ ہے

یہ رسالہ بھی امامیہ مشن لکھنؤ نے شائع کیا ہے اور مولانا سید علی نقی صاحب کی تحقیق کا شہداء کربلا حصہ دوم | نتیجہ ہے۔ اس کا حصہ اول، اب سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اس میں تمام شہداء کربلا کا ذکر نہ ہو سکا تھا اس لئے دوسرے حصہ کی اشاعت ضروری سمجھی گئی اس میں ۵۲ شہداء کی شہادت کا بیان کیا گیا ہے اور جس حد تک اسناد و حوالہ کا تعلق ہے، روایات پر اعتبار کر لینے والا انسان ان تمام برزئیات و تفصیلات پر یقین کر لینے کے لئے مجبور ہے، جو اس میں درج ہیں، لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل کسی وقت ظاہر کر چکا ہوں یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ ہنگامہ کربلا کے متعلق ایسی موثر گائیاں ممکن بھی تھیں یا نہیں۔

یہ اور بات ہے کہ فرمانہ کی حیثیت سے ہم ان واقعات کو پڑھ لیں، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی اہمیت بہت کم ہو اس کی قیمت ۵ روپے اور ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ

اس رسالہ میں سید محمد ہادی بیڑا سٹراٹجمن اسلام آبادی اسکول احمد آباد نے رسول اللہ کے مختصر حالات ماہ عرب | بچوں کے پڑھنے کے لئے یکجا کر دئے ہیں۔ عبارت بہت صاف و سلیس ہے اور انداز بیان شگفتہ۔ سب سے زیادہ مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس میں شوق صدر، شوق قمر وغیرہ ایسے واقعات کے اظہار سے گریز کیا گیا جو اور رسول اللہ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بچوں کے سامنے ایسی باتیں پیش کرنا جو ابتداء ہی سے ان کے دل و دماغ کو مایوس بنادیں اور توہمات پر یقین کرنا سکھائیں، سخت اصولی غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سید محمد ہادی صاحب نے اسی نیت سے ان باتوں کے بیان سے احتراز کیا ہے اور یہ احتیاط ان کی لائق ستائش ہے۔ اس رسالہ کی قیمت ۲ روپے اور مولانا موصوف سے مل سکتا ہے۔

پانچ چھوٹی چھوٹی فارسی ثنویوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف جناب محوی بدایونی ہیں۔ ان شارستان قدس | ثنویوں میں تعلیمات اسلامی کو شاعرانہ لیکن موثر لب و لہجہ میں بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب محوی مرزا عبدالقادر بیدل اور حکیم سنائی کے فلسفہ سے بہت متاثر ہیں۔ زبان و انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ ثنویاں خوب ہیں۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایوں

لطائف غالب | اس دو جزو کے رسالہ میں ایم۔ اے۔ شاہ نے غالب کے وہ لطائف جو غالب کے مکتوبات یا تذکروں میں ان کو اچھے معلوم ہوئے یکجا کر دیے ہیں، کتابت و طباعت اچھی اور اور کاغذ بھی قیمتی استعمال کیا گیا ہے، قیمت ہر سہ اور پانچ کاپیہ مکتبہ پنجاب ریلوے روڈ لاہور

قرآن پاک | مولوی عبدالواحد صاحب سندھی نے اس رسالہ میں تمام وہ ضروری معلومات یکجا کر دیے ہیں جو قرآن پاک کے متعلق بچوں کو معلوم ہونا چاہئے۔ یہ کتاب گویا قرآن کی تاریخ ہے نہایت سلیس انداز میں اور ایسے الفاظ میں کہ بچے انہیں آسانی سے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں، مکتبہ جامعہ دہلی نے اسے شائع کیا ہے اور اس کی قیمت ہے۔ یہ کتاب غالباً جامعہ کے نصاب میں داخل ہوگی، لیکن جامعہ کی اور تمام کتابوں کی طرح اسے بھی جامعہ کے حدود سے باہر ہر مسلمان بچے کے مطالعہ میں آنا چاہئے

جامعہ ملیہ کی تین اور کتابیں بچوں کے لئے | جنگوں کی بلی۔ انعامی مقابلہ۔ پوری جو کڑھائی سے شکل بھانگی مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کا سلسلہ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے جو پیام تعلیم میں چھپتی رہتی ہیں، یہ تینوں کہانیاں بھی اسی سلسلہ کی ہیں اور خوب ہیں ضرورت ہے کہ چھوٹے بچوں کے سامنے ایسی ہی کہانیاں پیش کی جائیں جو زبان کے لحاظ سے غلطی سے پاک ہوں اور نتیجہ کے لحاظ سے سبق آموز ہوں۔ یہ کہنا ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو جامعہ ملیہ سے بہتر اس خدمت کو انجام دے رہا ہو۔ ان کی قیمت علی الترتیب ۴ - ۳/۱ اور ۴/۱ ہے

اعجاز اکبر آبادی

غزل:

لکھنے نظم و دل و بالا نہ کیجئے
کیا کیجئے جو ان کی شقا نہ کیجئے
اچھا ہے درد دل کا مارا نہ کیجئے
یہ اور بات ہے کہ گوارا نہ کیجئے
کچھ کیجئے، مگر یہ ارادہ نہ کیجئے

برہم نگاہیوں سے تماشائے کیجئے
وہ حاصل حیات ہیں، وہ مرکز امید
وابستہ ہر فاش سے رہے یاد آپ کی
غم اور وہ بھی پھر غم الفت رہے نصیب
آپ اور مجھ سے ترک تعلق، نہیں نہیں

کوئین بھی کوئی اگر اس نے صلے میں دے
اعجاز شرح راز گوارا نہ کیجئے

دیوار کے اُس طرف

اُس طرف ہر رخ پراقتال جلوہ رنگ جمال
اُس طرف چشم مسرت میں رعونت کا شمار
اُس طرف گھنٹہ گھڑی گھڑیاں ہیں اوقات ساز
اُس طرف نازک کعبہ دولت میں بھولوں کی چھتری
اُس طرف ہے کاروبار زر پہ گھنٹوں گفتگو
اُس طرف کوٹھی پہ "ہلیم" کو قناعت ہی نہیں
اُس طرف سینے میں اک پتھر کا ٹکڑا جائے دل
اُس طرف ہیں کاٹی اور کسل سے مابتھے پہ بل
اُس طرف انفاس عالم ہیں مئے عشرت میں غرق
اُس طرف حاصل ہو اے گرم میں خس اور گلاب
اُس طرف سرگوشیاں کرتے ہیں برقی قمقمے
اُس طرف ہے خوبصورت جسم پر ہر جامہ تنگ
اُس طرف ہے ریڈیو پر نغمہ نو کی تلاش
اُس طرف روشن ہیں تعلیم و تمدن کے چراغ
اُس طرف ہے جادۂ ہستی، بساط کہکشاں

اس طرف ہر حیر و فرط ناتوانی سے نڈھال
اس طرف ہے غارِ رخ رنج و محنت کا غبار
اس طرف دنیا ہے قید وقت سے بھی بے نیاز
اس طرف افلاس کے ہاتھوں میں بھاری تہکڑی
اس طرف بیتاب کن یک پارہ ناں کی جستجو
اس طرف چھپر ہیں پورا گھر کا گھر عزت نشیں
اس طرف ہستی سراپا در دو کیسے پا بگل
اس طرف محنت کے باعث مرد کے بازو ہیں شل
اس طرف انساں سراپا گرواڑ پاتا بہ فریق
اس طرف ہے تشنگی اور روئے صحر کا سراب
اس طرف لڑتے ہیں تاریکی سے مٹی کے دسے
اس طرف صحت کے گہر جانے سے منہ کا زرد رنگ
اس طرف ٹوٹا ہوا اول اور مسلسل ارتعاش
اس طرف کچلا ہوا ہے جہل و پستی سے دماغ
اس طرف دم گھوٹ دینے والا زہر ملا دھواں

حل طلب ہے مدتوں سے ہمیشیں یہ مسئلہ
اُس طرف تو ہی خدا کیا اس طرف بھی ہے خدا؟

فضل الدین اشعر

خود شناس اقبال

دیدہ دل باز کر شمع حقیقت سے دیکھ
تین محبت کا زخم بھر نہیں سکتا کبھی
نشہ جام خودی، پڑھ کے اترتا نہیں
راہِ جہنم و جاں راز ہے اک طرفہ راز
کل تلک آواز تھی زیر و بزم ساز میں
گاہ صدا ساز میں گاہ صدا میں ہی ساز
آج ہے خود ساز گم اپنی ہی آواز میں
حق نگر و خود شناس مر کے بھی مرنے نہیں

لغے متاع وجود ہو گئی صرف خودی

اتنی فروزاں ہوئی شمع کہ خود جل بھی

سرست تکتی

ہم کی پہلی باتیں

ہم سخن ہم نوا نہیں ملتا
ایسی منزل پہ آگیا ہے شباب
زندگی میں مزہ نہیں ملتا
سائے راستہ نہیں ملتا
فطرت میں رنگ بھرنے کی ہمت نہ کر سکے
منا ہی تھا جینے کی حسرت نہ کر سکے
مجبور یوں کے حیر کا کیا دیکھے جواب
ہم چاہتے تھے اور محبت نہ کر سکے

بہار (اسراوی)

غزل:

خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اور انداز ترا حسرت منزل ہو جائے
ہاں چین زار محبت میں بہار آتی ہے
دل صد پارہ سے یوں ابھی ہو وہ شوخ نگاہ
اپنے بسمل کے تڑپنے کا تماشہ تو دیکھ
ایک اچھٹی سی نگہ پر ہے یہ بتیابی دل
ہائے کس لطف سے یہ عمر دور و زہ گزرے
امحال طاقت دیدار کا جائز ہے، مگر
مجھ کو الزام نہ دے، آپ کو بدنام نہ کر
مان جائے بھی اگر حسن تماشا دشمن
ہو شمن دل سے کہیں معرکے سر ہوتے ہیں
ناخدا سے یہ کہے کون، کہ ہمت ہو انگر

دل جو لذت کش محرومی حاصل ہو جائے
نام اک نکبت برباد کا جب دل ہو جائے
جیسے سورج کی کرن پھول پہ اٹل ہو جائے
تو سہی تو بھی جو بے درد نہ بسمل ہو جائے
حال پوچھے کوئی اس وقت تو مشکل ہو جائے
تھوڑی مستی بھی اگر ہوش میں شامل ہو جائے
جب نظارہ بھی دھڑکتا ہوا اک دل ہو جائے
دعویٰ عشق غلط کیوں ہو، جو باطل ہو جائے
شوقِ بیتیاب سراپردہ محل ہو جائے
کاش دیوانہ کوئی رہبر منزل ہو جائے
موج طوفان بلا و امن ساحل ہو جائے

کیا کرے کوئی گلہ ان کے تغافل کا اثر
شوق جب آپ تماؤل کا قائل ہو جائے